گردِ راہ

از

وحید احمد

قیمت دو روپیہ

ملنے کا پتہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

[illegible]

بہ حضور

عالیجناب آنریبل رفیع احمد صاحب قدوائی

منسٹر رسل و رسائل انڈین یونین

فہرست

مضامین

گذارش

اسلاف کی دولت کی حفاظت ہمیشہ سے اخلاف کا فرض رہا ہے مگر آج کل دولت سمیٹنا جتنا مشکل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اور پھر ایسے شخص کی ادبی دولت جس کی فیاضی کی کوئی حد نہ رہی ہو کہاں کہاں سے سمیٹوں اس لئے زمان و مکان کی قید عائد کرنی پڑی یعنی یہ فیصلہ کیا کہ جناب والد صاحب قبلہ کے صرف وہ مضامین ایک جگہ جمع ہو جائیں جو حالیہ ہیں اور جو قریب قریب لکھنؤ میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سب مضامین فائلوں کے انبار سے آنکھیں چرا کر اور ملاقات کرنے والے اصحاب سے دامن بچا کر جو لمحے میسر آسکے ان میں قلمبند کئے گئے ہیں اور سب کے سب گویا گردن دبا کر لکھوا لئے گئے ہیں یعنی احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان سے موجودہ

زمانے کی روش اور تحلیل کا ڈھنگ معلوم ہو سکے۔ اور کچھ نہیں تو ان مضامین سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ فرائض منصبی کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ادب کے حسین اور سکون بخش چشمے پر اُس کے تشنہ کام پہنچ ہی جاتے ہیں

لکھنؤ یونیورسٹی
مورخہ ۱۰؍ اپریل ۴۵ء

خاکسار
فرید احمد مسعود

تعارف

نہ یہ دیباچہ ہے نہ مقدمہ، محض تعارف ہے اور اُس کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی، مگر مسٹر وحید احمد صاحب نے ازراہِ محبّت یہ فرمائش کی کہ میں اُن کے مضامین کے اس مجموعے پر کچھ لکھ دوں تو ایک گذرا ہوا بہت دلچسپ اور دلنواز زمانہ یاد آگیا۔ بڑھاپے کے قدرتی حقوق میں ایک بڑا حق یہ ہوتا ہے کہ بوڑھا آدمی اپنی گذری ہوئی زندگی کی کوئی داستان جہاں چاہے اور جب چاہے بیان کردے۔ اُسکے لئے کوئی روک ٹوک نہیں، سفید بال اس کی داستان گوئی کے حق کی ضمانت ہیں۔ اربابِ فہم اگر اس داستان گوئی سے اُکتا بھی جائیں تب بھی مروّت کو راہ دیتے ہیں اور بہت ہی ہمدردی کے ساتھ فرما دیتے ہیں، اس بوڑھے بچارے کو کہہ لینے دو! اس کی یاد کی پرچھائیاں، کتنی ہی غیر دلچسپ ہوں مگر اُسے عزیز ہیں۔ غریب! اُن گذری منزلوں پر لوٹ کر جاتو

سکتا نہیں، صرف انھیں یاد ہی کر سکتا ہے !!

وحید احمد صاحب سے بہت عرصہ کے بعد اب لکھنؤ میں ملاقات ہوئی اس طویل زمانے میں انھوں نے بہت سی روحانی اور مادی منزلیں طے کیں زندگی کا کاروبار شروع بھی سیاست سے کیا تھا اور وہ پھر لوٹ کر بھی اُسی میدان میں آئے۔ اُس زمانے کی دھندلی پرچھائیاں اب بھی میرے گرد وپیش ہیں۔ جب وحید احمد صاحب انگریزی تعلیم و تربیت کا ایک نظر افروز مجسمہ بنے ہوئے تھے، سیاسی سرگرمیوں کا زمانہ تھا، علی برادران کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور پُرجوش اور سرفروش نوجوانوں کا ایک جتھا انکے گرد وپیش تھا، اُسی جتھے میں وحید احمد صاحب بھی تھے۔ علاوہ محمد علی کے میرے اُن کے درمیان ایک بڑا رابطہ اُن کا ادبی ذوق تھا، اور میرے اور ان کے دونوں کے ادبی ذوق کے پیرِ مُغاں، مرحوم و مغفور سید محفوظ علی تھے دوستوں کی صحبتوں کا وہ سدا بہار نخلِ ثمر دار! ادبی محفلوں کی وہ شمعِ فروزاں! لمبی سفید ڈاڑھی کے حاشیہ پر وہ سدا بہار تبسم زیرِ لب! مسجد کی محراب میں زندگی اور زندہ دلی کی وہ رنگین قندیل! مولانا محمد علی کی اخباری زندگی کے

ہنگامہ میں ہم اور وہ ہمسفر ہوئے، اور آخری دم تک ہمسفر رہے، اُن کا سفر میرے سفر سے پہلے ختم ہو گیا لیکن اِس وقت جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے مُسکرا رہے ہیں!

سیّد محفوظ علی کی صحبت میں اُس زمانے کے نوجوان اور ناک نقشے سے درست وحید احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھر جب انھوں نے مرحوم کے اشارے سے رسالہ "نقیب" نکالا تو اس کے صفحات پر کچھ مزاحی مضامین میں نے بھی لکھے، اس کے بعد تو راہ و رسم محبت استوار ہو گئی، پھر جب درمیان کے بہت سے رشتے ٹوٹ گئے تب بھی وہ جو اشتراک مذاق کی ایک لگن تھی باقی رہی، اور جب میں خراب آباد حیدرآباد سے ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آیا اور سُنا کہ وحید صاحب پارلیمانی ارتقا کی منزلیں طے کر رہے ہیں تو انھیں تلاش کیا اور بہت زمانہ بعد دیرینہ روابط کی تجدید کی، معلوم ہوا کہ علم و ادب کا مذاق پروان چڑھ رہا ہے اور پارلیمانی مشاغل کے گرد و غبار میں ایک گوشہ ایسا بھی ہے جہاں قلم کا مقام ہنوز محفوظ ہے۔ ادبیت کا رنگ تو کچھ بدلا ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ اس میں سنجیدگی کچھ زیادہ ہو گئی ہے، لیکن ڈاڑھی کی ملّایانہ سنجیدگی اور "خشکی" سے اب بھی وہ مذاق محفوظ ہے — الحمدللہ! ادیب اگر ملّا ہو جائے یا ملّا اگر

ادیب بننے کی کوشش فرمائے تو میرے مُنہ کا مزا خراب ہو جاتا ہے پہلے نظر میں تو میں گھبرایا کہ اُن جامہ زیب وحید صاحب کے بجائے جنھیں میں جانتا تھا یہ کھدر پوش بزرگ کہاں سے تشریف لائے، مگر اسی لمحہ معلوم ہوا کہ جی نہیں - یہ معاملہ

درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

کا عکس ہے، بفضلہ تعالیٰ ریش شرعی کے الجھاؤ سے مذاق ادب اب بھی محفوظ ہے!

جن مضامین کا یہ تعارف لکھ رہا ہوں، ان میں سے صرف ایک مضمون کا کچھ حصہ میں نے پڑھا ہے - وحید احمد صاحب کی پارلیمنٹری رولنگ یہ تھی کہ سارے کتابچہ کے لئے ایک مضمون کا کچھ حصہ پڑھ لینا بالکل کافی ہے! لکھنے کا مرض میرا پُرانا مرض ہے، تھوڑا سا بہانہ بھی مل جائے، اور معاملہ ہو وحید احمد صاحب جیسے ہمصفیر دیرینہ کا، تو تعارف کیا دیباچہ اور مقدمہ بلکہ ایک رسالہ لکھ دینے پر آمادہ رہتا ہوں - فن اخبار نویسی کا بڑا فائدہ اگر ہے تو یہی ہے کہ آدمی بے سوچے سمجھے سب کچھ لکھ سکتا ہے، کوئی علم ہو، کوئی موضوع ہو، جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اخبار نویس لکھنے میں کبھی عذر نہ کرے گا - لہٰذا وحید احمد صاحب اگر علم الافلاک یا

طبقات الارض پر بھی کوئی کتاب لکھتے تو میں اس پر بھی بلا تکلف ایک "عالمانہ" مقدمہ لکھ دیتا! آخر ساری عمر صحیفہ نگاری کی تو کیا اتنا بھی نہ سیکھتا!

اقبال کے نظریہ سعی و عمل پر وحید احمد صاحب کے مضمون کا یہ حصہ میں نے پڑھا اس میں تو انھوں نے تصوف اور تفسیر حیات کی بعض بہت ہی نازک تنقیحات چھیڑ دی ہیں۔ میں ایک "نیچری" قسم کا آدمی ان بلندیوں پر میری رسائی کہاں، مگر ہاں ایک بات ضرور کہہ سکتا ہوں، وہ یہ کہ اس نقطۂ نظر سے اقبال کا مطالعہ ہمارے ادب میں اپنی آپ ہی مثال ہے۔ اس موضوع کے لئے ایک مختصر مضمون بالکل ناکافی ہے، کیا اچھا ہو کہ وحید احمد صاحب ایک قدم آگے بڑھیں۔ ہمارے شوقین اہل قلم نے علامہ اقبال کی جو گت بنائی ہے وہ تو ایک ایسا گناہ ہے جس کے تصوّر سے بھی مجھے اُبکائی آتی ہے جس نوخیز لڑکے کا جی چاہا اس نے اقبال پر ایک کتاب لکھ ڈالی۔ اور اللہ پنجاب کو سلامت رکھے اقبال کا نام آیا اور کتاب نکلی حسنِ عقیدت کا یہ عالم کہ حضرت علامہ مغفور کو بانی پاکستان بنا ڈالا۔ ۴۲ء کی قرارداد سے ان کی زندگی کا ڈانڈا یاروں نے کچھ اس چابکدستی سے ملا دیا کہ میں تو آنکھیں ملتا رہ گیا! جنت میں اقبال کی روح اس تحسین ناشناس پر ماتم کرتی ہو تو

تعجب نہیں۔ وہ کہتی ہو گی کہ

میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا!

شک ہے کہ وحید احمد صاحب نے اقبال کی مفروضہ سیاست کے بجائے ان کے فلسفے کی گہرائیوں کو کریدا۔

اب میں زیادہ کیا کہوں۔ افسوس اس کا ہے کہ وحید احمد صاحب اگر پارلیمنٹری سکریٹری نہ ہوتے تو خدا جانے کتنے بہتر اور کس قدر زیادہ بلند پایہ ادیب ہوتے! پھر بھی بسا غنیمت ہے کہ وہ اپنے قدرتی اور ابتدائی مذاق کو زندہ رکھے ہیں ؎

پھر کہیں سے ڈھونڈھ لا اس کو بڑی نعمت ہے یہ
زندگی ہی کیا جو دل بیگانۂ پہلو ہوا!

لکھنؤ
۹ر جنوری ۱۹۴۲ء

(قاضی) محمد عبدالغفار

پیش لفظ

وحید احمد صاحب سے اربابِ ادب اور اربابِ لیاقت دونوں واقف ہیں۔ بعض نازک مزاج ادیبوں کے نزدیک سیاست بے ادبی ہے، مگر موجودہ دَور میں زندگی اور ادب کے رشتے کو سیاست ہی مضبوط کرتی ہے۔ اسی لئے ادیبوں کے سیاسی شعور اور اربابِ سیاست کے ادبی رتبے کو کون نظرانداز کر سکتا ہے۔

جن لوگوں نے رسالہ نقیب دیکھا تھا، اُن کے لئے گردِ راہ میں آج بھی دلکشی کا سامان ہے۔ وحید احمد صاحب کی ادبی کاوشوں سے رسالہ نقیب باغ و بہار بنا رہا۔ اُن کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا کہ اس زمانے کے تمام مشہور ادیبوں اور شاعروں کو انھوں نے نقیب کی انجمن میں لا بٹھایا۔ اور میر محفوظ علی کی نقاب پوش شخصیت تو صرف نقیب کے صفحات ہی میں بے نقاب ہوئی۔

زندگی کے متعدد انقلابات بھی وحید احمد صاحب سے ادب کا ذوق اور انشا کی چمن بندی کا شوق نہ چھڑا سکے۔ تصوّف بھی ان کی اس چنگاری کو فنا نہ کر سکا۔ گردِ راہ میں سیاست، ادب، تصوف، فلسفہ، سبھی کچھ ہے

اور اگرچہ بکھرا ہوا ہے مگر ان بکھرے ہوئے موتیوں میں بڑی آب و تاب ہے
اکبر و اقبال پر وحید صاحب کے مضامین خصوصیت سے پڑھنے کے
قابل ہیں۔ اکبر کی شخصیت پر اُن کے لطیفوں سے جو روشنی پڑتی ہے وہ
اُن کے بہت سے خطوط سے نہیں پڑتی۔ اقبال کی انسان دوستی اور
نظریۂ سعی و عمل کو اگرچہ مذہبی زبان میں پیش کیا گیا ہے، مگر اس کی عام
اہمیت واضح ہے۔ دوسرے مضامین زیادہ تر سیاسی مباحث سے متعلق
ہیں، مگر ان میں بھی ایک شگفتہ اور زندہ دل شخصیت کا تبسم زیرِ لب
ملتا ہے۔ اسی تبسم زیرِ لب کی وجہ سے یہ مضامین دلکشی اور جاذبیت رکھتے ہیں۔
گرد راہ کو پڑھ کر خیال آتا ہے کہ اگر وحید احمد صاحب رضا علی کے
اعمال نامہ کے رنگ میں اپنے خود نوشت حالات لکھیں تو اس میں ہمارے
دَور کی شخصیتوں، ہماری انجمن کے چراغوں اور ہماری نسل کے معماروں
کے ایسے ایسے مرقعے ملیں گے کہ ان سے آیندہ دور کے مورّخ کو اِس
دَور کے جانچنے میں آسانی ہوگی۔ ان کے طرزِ تحریر کی شگفتگی اور شادابی
اس کتاب کی مقبولیت کی ضامن ہوگی۔ کاش وہ اِس طرف جلد توجہ
کرسکیں۔

آل احمد سرور

لکھنؤ
۱۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء



وحید احمد

انسان اقبال کی نظر میں

لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو سے ۲۱، اپریل سنہ ۱۹۴۴ء کو براڈکاسٹ ہوا

عشرت رحمانی صاحب نے نثر اور بہزاد صاحب نے ترنم سے نظم پڑھی

خدا بخشے ڈاکٹر اقبال عجیب و عظیم ہستی تھے۔ شاعر و فلسفی ہونے کے علاوہ ان کے سچے عاشقِ رسول اور پکّے مجذوب ہونے میں کلام نہیں۔ صوفی والدین کی صحیح تربیت اور مشرق و مغرب کی اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ انھوں نے انسانی حقیقت کا راز معلوم کیا اور انسانیت کو اعلیٰ و ارفع بنانے میں اپنی زندگی وقف کردی۔ مبداءِ فیاض نے ان کو دماغ بھی نورانی عطا فرمایا تھا۔ ابتدا ہی سے انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع انسان کو بنایا۔

انسان عجیب رازِ فطرت ہے۔ وہ اپنی ذات یا خودی کو

تمام کائنات سے زیادہ محبت کرتا ہے لیکن تمام توجہ خارجی حقیقتوں
اور ذہنی تخیلات پر صرف کرتا ہے۔ اس کی ذات کی حقیقت
کے متعلق مختلف نظریئے قائم کیئے گئے ہیں بعض کہتے ہیں کہ
انسان محض مادہ کا مجسمہ ہے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ صرف روح
ہے جو عارضی طور پر جسم میں مقید کردی گئی ہے۔ کوئی اس نتیجہ پر
پہونچا کہ مسٹر بندر کی ارتقائی صورت ہے اور کسی نے یہ ثابت
کیا کہ وقت اور ہنگامہ کا اتفاقیہ نتیجہ ہے جس کا کام ضرورت
ارضی کو پورا کرنا ہے اور بس۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ روح اور جسم کا
اجتماع ہے۔ وہ حق بھی ہے اور خلق بھی۔ برائیوں سے پاک و
صاف ہونے کے بعد قربت الٰہی اس کا مقصود ہے اور جمالِ
لایزال کی دید اس کی بہشت ہے۔ یہی آخری نظریہ اقبال کا
مذہب ہے۔ مختلف اسباب کی بنار پر اس نظریے میں مغالطے
پیدا ہوگئے اور اسی زمانے میں مادیت اپنی فضیلت کا اعلان
کرنے لگی۔ اقبال نے ان دونوں کو نہایت کمال کے ساتھ
پرکھا۔ نٹشے کا مافوق الانسان جب ذوقِ گناہ کے لیئے بیتاب

نظر آیا تو اقبال نے فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرِ عقیدت و نیازمندی جھکا دیا اور وہیں سے رازِ انسانیت پاکر بقائے دوام حاصل کر لی۔[1]

انسان کے متعلق اقبال کا نظریہ از اول تا آخر من عرف نفسہ فقد عرف ربہ سے ماخوذ ہے۔ ابتدائی کلام میں روایات کی بناء پر اظہار خیال کیا ہے لیکن خلوص اور فکر نے آخر آخر سیدھے راستے پر لگا دیا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو۔

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

---

[1] یہ اشعار براڈ کاسٹ میں مضمون سے حذف کر دیئے گئے تھے ۱۲

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں — کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر — وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بادل کو ہوا اُڑا رہی ہے — شانوں پہ اُٹھائے لا رہی ہے
تارے مستِ شرابِ تقدیر — زندانِ فلک میں پا بہ زنجیر
خورشید وہ عابدِ سحر خیز — لانے والا پیامِ برخیز
مغرب کی پہاڑیوں میں چھُپ کر — پیتا ہے مئے شفق کا ساغر
لذت گیرِ وجودِ ہر شے — سرمستِ نمودِ ہر شے
کوئی نہیں غمگسارِ انساں — کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

فطرتِ انسانی یہی ہے کہ نامعلوم اور غائب کی جستجو کرے۔ جب انسان پردہ دری نہیں کرسکتا تو متحیر ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنی فطرت میں مگن ہے اور ہر وجود نمایش میں مبتلا ہے۔ اس احساس کے بعد اگر عقل اور علم اپنی بیکسی پر متحیر ہو جائیں تو بعید نہیں۔ یہی احساس، فکر و شوق کو تیز کرنے کا باعث ہوا اور آخر کار مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت سمجھ کر تسلی ہو گئی کہ انسان ہی وہ ہستی ہے جس کو قدرت و اختیار حاصل ہے اگرچہ حقیقتِ مطلق کے مقابلہ میں محدود و ناقص ہے۔

لہٰذا خیال و تحقیق کو اس طرح ظاہر کیا،۔

منظرِ چمنستان کے زیبا ہوں کہ نا زیبا
محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے

رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو
فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستیٔ دانا ہے۔ بینا ہے توانا ہے

اس تحقیق پر اقبال مطمئن نہیں ہوے۔ ذوق و شوق نے اور آگے بڑھایا۔ پھر معمہ حل کرکے جہانِ انسانیت کے سامنے ایک فلسفۂ خودی ببانگِ دُہل پیش کر دیا۔ پیدائشِ آدم سے مقصدِ انسانیت کا سُراغ مل گیا۔ تخلیقِ آدم ہی خودی کی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قوتیں انسان کو عطا کر دیں اور اِس انعامِ الٰہی کے بعد ہستی میں شور و ہنگامہ

بپا ہو گیا اور قیامت آگئی ۔

میلادِ آدم

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے ۔ خود شکنے ۔ خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

شاہدِ مطلق کو اپنی نمایش منظور ہوئی ۔ اس تمنا کا اظہار محبت وعشق کی وجہ سے ہوا ۔ انسان کو علم وقوت عطا کر کے اپنا نائب بنا دیا ۔

انسان اور عشق میں ازل سے چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ عشق ہی زندگی میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے حیاتِ ابدی حاصل ہوتی ہے۔ عشق ہی عقل کی فسوں کاری سے محفوظ رکھتا ہے اور عشق ہی حقیقتِ مطلق کو بے حجاب دیکھتا ہے۔ جنت میں آدم کو اپنے عطیات استعمال کرنے کا شعور نہ تھا۔ شیطان جب محرک ہوا تو محسوس کرتے ہی آزادی سے کام لیا۔ چنانچہ حکم الٰہی سے فرشتوں نے آدم کو رخصت کر دیا۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سُنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے خوشتر تری شکر خوابی
گراں بہا ہے ترا گریۂ سحر گاہی
اسی سے ہے ترے نخلِ کہن کی شادابی

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

نافرمانی کی وجہ سے جب اس دنیا میں آدم بھیجدیا گیا تو اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ عطیاتِ فطرت کو صحیح طور پر استعمال کرے اور اپنی اصلیت پر پہنچ جائے۔ اپنے سوز و ساز۔ درد و آرزو۔ فکر و تدبر اور جد و جہد سے خود اعتمادی پیدا کر کے فطرت کو تسخیر کرے۔ جب آدم کا زمین پر نزول ہوا تو روحِ ارضی نے اس طرح استقبال کیا۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردے میں چھپا دیکھ
ایامِ جُدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بیتاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضَو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے

تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خونریز و کم آزار ازل سے

ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

فطرت کا خود تقاضا یہی ہے کہ اہلِ نظر کے سامنے بے حجاب اور برہنہ ہو جائے۔

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شئے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی
کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسمہائے پنہانی
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزند آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عُریانی
یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشک خونیں سے
کیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی

مقابلہ کرنے کے لئے اقبال نے زمانۂ حاضر کے انسان کی تصویر کھینچی ہے کہ مادّیت پر قربان ہونے والے کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

اس کے مرجانے یا زندہ رہنے کا نظامِ شمسی پر مطلق اثر نہیں پڑتا۔ اپنی تمام قوت صرف کرنے کے بعد وہ عالمِ اجسام میں ایسا ہی مجبور ہے جیسے فرشتے عالمِ ارواح میں۔

عشق ناپید۔ خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(محذوف کردہ حصہ ذیل میں درج ہے[1])

---

[1] حصہ ذیل کو ریڈیو نے حذف کر دیا تھا:۔

انسان کی دونوں تصویریں دکھا کر اقبال بتاتے ہیں کہ خلق ہونے کی وجہ سے جب انسان اخلاقِ الٰہی حاصل کر لیتا ہے تو اس کو مومن کا خطاب مل جاتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

انسان نہ صرف خلق ہے بلکہ حق بھی ہے۔ قوتِ عشق اسے تختِ توحید پر بٹھا دیتی ہے۔ ہیملٹ کا پارٹ کھیلنے کا نتیجہ اگر کھیلنے والے کو ہیملٹ بنا دے تو بعید از عقل نہیں۔ قوتِ تخلیق پیدا کر کے انسان خلاق بن جائے تو کفر کہاں ہے۔ یہ تو وحدت الوجود ہے۔ انسان کی خالقیت محض حادث ہے۔ اپنے حق ہونے کی شانِ انتہائی کے ساتھ انسان جواب دیتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان کوہسار و راغ آفریدی　　خیابان و گلزار و باغ آفریدم

ضبطِ نفس، اجد وجد اور ایمان کی یہ بہترین سند ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی　　ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کے عیار اسکے ارادے　　دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ کی ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کے سرودِ ازلی اس کے شب و روز　　آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن

لیکن بایں ہمہ بندہ بہر حال بندہ ہے اور اسی پر اسے فخر ہے اور اقبال کی نظر میں بندگی ہی انسانی معراج ہے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

مگر بندگی کے احساس کی بیجا اُفتاد انسانیت کی حقیقت کو ابھرنے نہیں دیتی اقبال اس احساس کو کس انداز میں اُبھارتے ہیں اور کس الفاظ میں درسِ بندگی دے کر انسانیت کے راز کو آشکار کرتے ہیں ؎

خودمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

آخر کار اقبال نے انسان کی حقیقت یوں واضح کی ہے کہ یہ نہ مجرد

روح ہے اور نہ مجرد جسم بلکہ ان دونوں کے توازن کا نام ہے ؎

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ صبح ازل سے رہا ہے محوِ سفر
مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

اللہ اللہ۔ یہ انسان ہے اور یہ اس کی قدرت۔ خدا راضی ہو جائے اقبال سے کہ اس نے اس تاریک عہد میں یہ راز آشکار کیا۔

اقبال[1] اپنی نظم انسان اور بزم قدرت میں انسان کی حقیقت اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزار وجود

---

[1] یہ ریڈیو نے از خود اضافہ کیا تھا ۱۲

آہ اے رازِ عیاں کے نہ سمجھنے والے
حلقۂ دامِ تمنا میں اُلجھنے والے

ہائے غفلت کہ تری آنکھ ہے پابندِ مجاز
ناز زیبا تھا تجھے ۔ تو ہے مگر گرمِ نیاز

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے
نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیہ کار رہے

هُوَاللّٰہُ اَحَد

خلاقِ دو عالم تو مختار و توانا ہے
تو آپ ہی سب کچھ ہے اور مثل سے بالا ہے

اضداد میں ممکن ہے اثبات میں کامل ہے
ہر شے کی حقیقت ہے ہر شئے سے مبرا ہے

مشہود تو ہوتا ہے محسوس نہیں ہوتا
مستور ہے جلوت میں خلوت میں ہویدا ہے

وہ عبد مکمل ہے اور فقر ہے فخر اس کا
احمد تیری قدرت کا بے مثل تجلّی ہے

توحید کو چمکایا اس ہستیٔ واحد نے
یہ جانِ محبت ہے فطرت کی تمنا ہے

رونق تری ہستی کی قائم ہے اُسی دم سے
یہ نور ہزاروں میں ہر آن چمکتا ہے

میں بندہ عاجز ہوں اور عجز پہ نازاں ہوں
گر جو تری مرضی ہو مرضی تری اولیٰ ہے

یہ جد و جہد میری تسکین ہی تسکین ہے
ہوتا ہے وہی آخر جو کچھ ترا منشا ہے

اس نام کی خاطر سے احمد پہ کرم کرنا!
ناکارہ و بے بس ہے لیکن ترا بندہ ہے

اقبال اور نظریۂ سعی و عمل[1]

ہر الہامی کتاب کی تفسیر ضروری ہے۔ تفسیر زمانہ کے رجحانات۔ معیار و اقدار (VALUES) پر مبنی ہوتی ہے۔ رجحانات زمانہ کی رفتار کے مطابق بدلتے رہتے ہیں لہذا تفسیر بھی بدل جانا چاہیئے۔ جو الہامی کتابیں محض اپنے عہد و ماحول کی اصلاح کرتی ہیں اور وقتی ہوتی ہیں وہ آگے چل کر بدلے ہوئے زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتیں اور وہ اُس خاص عہد کی تاریخِ ہدایت بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایسی کتابوں کے ماننے والے ترمیم و تحریف سے کام لے کر بدلے ہوئے زمانے کی عقول کو مطمئن کرنے کی کوشش میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن پاک کی نوعیت و خصوصیت سب سے زیادہ اہم۔ نمایاں اور جُدا ہے۔ وہ تحریف سے قطعی مبرّیٰ ہے۔ اس کے ستّر بطن بتائے گئے ہیں۔ وہ زمان و مکان پر

---

[1] مطبوعہ رسالہ برہان دہلی ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۲ء

غالب ہے۔ اس کی ہدایت و کارفرمائی مستقل اور مسلسل ہے اور اس کے متعلق بجا اعلان ہے۔

ذلك الكتاب لاريب فيه

قرآن پاک کی تفسیر، اُس کے عہد تنزیل میں، ماحول کے مطابق کی گئی۔ بُت پرستی۔ یہودیت اور عیسائیت قرآن پاک کا ماحول تھا۔ لہذا تفسیر قرآنی اُن ہی رُجحانات کی بنار پر کی گئی جو غالباً معتقدات سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس تفسیر نے ان معتقدات کی اصلاح کر کے توہمات کو عمل صالح اور ظنیات کو یقینیات سے بدل کر زمین کو آسمان بنا دیا۔ بعد میں یونانی فلسفہ و منطق نے جو خود منجملہ قیاسیات ہیں ان اصلاح شدہ معتقدات پر حملہ کیا۔ قرآن پاک نے اُنھیں کے طرز میں اپنی تفسیر ظاہر کر کے اپنی حقانیت کا دوسری طرح ثبوت پیش کر دیا۔ اس نئی تفسیر کی تاریخ کا سمجھنا آسان نہیں۔ اہل منطق نے محض ظاہر پر مادی صورت سے استدلال کیا۔ اور معتزلہ نے باطنی پہلو کو نظر انداز کر کے ظاہری منطق کو نباہ دیا۔ اب یہ بحث آپڑی کہ محض ظاہری پہلو سے مفہوم واضح اور

مکمل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لہذا اُن کے مقابلہ میں اُن ہی میں سے باطنی پہلو کو بھی چمکانے والے میدان میں اُتر آئے۔ اب یہ تین مکھی جنگ شروع ہو گئی۔

اشراقین اور معتزلہ کی بحثیں بذات خود عبرت انگیز بھی ہیں اور بصیرت افروز بھی۔ پھر ان دونوں کے اہل فلسفہ سے مباحث بھی سبق آموز ہیں۔ متقدمین سر درگریباں تھے کہ تئے مفہوم سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے تھے اور متاخرین نے عمل اجتہاد سے کام لیا کیونکہ علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ کو منطبق کرنا آسان کام نہ تھا۔ اسلامی سلطنت کے انحطاط۔ ایرانی تعیش اور یونانی و ہندوستانی فلسفوں کی موشگافیوں نے اس عہد کے رجحان کو ایک معمہ بنا دیا لہذا قرآنی تفسیر میں کبھی مادیت کا غلبہ رہا۔ کبھی روحانیت کا زور رہا۔ اور کبھی مادیت و روحانیت میں توازن پیدا کیا گیا۔ بایں ہمہ انتشار قرآن پاک اپنے الفاظ اور مفہوم کے ذریعہ برملا ہدایت کا ذریعہ بنا رہا۔

ڈاکٹر اقبال نے علوم جدیدہ کی تکمیل کی۔ جملہ مذاہب کا بہ نظر غائر

مطالعہ کیا۔ قرآن پاک کی مختلف عہدوں کی تفاسیر پہ عبور حاصل کیا۔ ہر گروہ کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیا۔ اور پھر قرآن پاک کی حقانیت کو اپنے عہد کی عقول کے مطابق۔ اپنی شاعری کے ذریعہ واضح کیا۔

قرآن پاک کا اصل موضوع "انسان" ہے۔ کل کائنات تمام فطرت۔ جملہ اشیاء۔ سارے علوم و فنون۔ زمین و آسمان۔ دین و دنیا۔ اس انسان ہی سے متعلق ہیں۔ اگر انسان کی حقیقت کا اور اس کی ابتدا اور انتہا کا مفہوم واضح ہو جائے تو انسانی معمہ آسانی سے طے ہو سکتا ہے اور یہی قرآن کی بہترین تفسیر ہے۔

قرآن پاک ابتداء یوں کرتا ہے:۔ اللہ جل شانہٗ کو اپنی قدرت کا اظہار منظور ہوا تو "کُن" فرمادیا۔ ازل سے لے کر ابد تک کی تمام فطرت نے بلا توقف تعمیل کی۔ چنانچہ فیکون۔ یہ "کُل" فطرت محض علم الٰہی میں ظاہر ہوئی اور اس کو "اعیان ثابتہ" یا "صور علمیہ" کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے علم الٰہی سے ازل میں جس شئے کا وجود ہوا وہ "نورِ محمدی" تھا۔ اسی کو "قلم" سے بھی موسوم کیا جاتا ہے جس نے "لوحِ محفوظ" پر کل مخلوق کا پروگرام لکھ دیا کہ

"عالم امر" سے "عالم خلق" میں ہر ہر شئے کا کس کس طرح وجود ہوگا اور کیا کیا حشر ہوگا۔

ارتقاء قابل لحاظ ہے کہ اس "نور محمدی" سے مجرد نورانی ملائکہ بنائے گئے پھر اس نورانیت میں آتش کا اضافہ کرکے اجناء پیدا کئے گئے۔ ابلیس اسی جنس سے ہے اور وہی معلم الملکوت بھی بنایا گیا۔ قدرت کاملہ نے اس سے بھی آگے بڑھ کر جدت میں ترقی کی اور نور و آتش میں خاک کی آمیزش کردی اور پھر صرف جمادات و نباتات و حیوانات ہی پر بس نہ کی بلکہ یہ اعلان کرکے کہ ہم اپنا خلیفہ بنانا چاہتے ہیں اپنی صناعی کی داد خود دے لی۔ اس آخری صنعت آلہی کا نام "انسان" ہے۔ ازل میں جو تماشا ہوا وہ مذہب پرست گروہ سے پوشیدہ نہیں۔ غرض جنت سے نکل کر انسان نے دنیا بسادی ؎

زماگرم است ایں ہنگامہ بنگر شور ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد (غالب)

بخیر (خوبی) دنیا کی زندگی گذارنے کے بعد انسان "حیات ابدی[1]" کا

---

[1] صدق و صفا سے زندگی نشو و نما سے زندگی تا ابد از ازل بتا ذات خدا سے زندگی

مستحق بنتا ہے جس میں "لقائے الٰہی" فردوس گوش اور جنت نگاہ بن کر اُس کا بہترین انعام ہے۔ ظاہری شرع یہی بتاتی ہے کہ انسان کی یہی انتہا ہے یعنی یہ وہی زندگی ہے جو یہاں دنیا میں آنے سے پہلے ازل میں اُسے حاصل تھی۔ مگر یہ انتہا اُس کی ازلی ابتداء کا دوسرا درجہ ہے لہٰذا اس کو حیات ابدی کہنے میں تکلف ہو سکتا ہے۔ لقائے الٰہی میں مدارج کا بھی امکان ہے۔ صوفیاء نے شرع کے اس تکلف و حجاب کو طے کر لیا۔ انھوں نے اس دوسرے درجے سے گذرنے کے لئے "وصل" کا مضمون ضروری سمجھا یعنی انتہا وہی ہونا چاہیئے جو ازل کی ابتدا تھی۔ اور اسی کو "حیات ابدی" کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح انتہا و ابتدا کو ایک کہہ کر حیاتِ انسانی کو ایک دائرہ اور حلقہ کی شکل دے دی۔

اصل سے جدا ہو کر عالمِ خلق میں آنے تک جو منازل انسان کو طے کرنا پڑے وہ صوفیاء کے نزدیک "قوسِ نزولی" کہلائے۔ عالمِ خلق سے اپنی اصلیت تک پہنچنے کے لئے جو مقامات طے کرنا پڑے وہ "قوسِ عروجی" سے نامزد کئے گئے۔ دونوں قوسین سے مل کر

دائرہ بن جاتا ہے۔ قوسِ نزولی میں "اختیار" کا پتہ نہیں چلتا۔ قوسِ عروجی میں بغیر جد و جہد اور عمل و حرکت کے کام نہیں چلتا[1] اور یہ جد و جہد بغیر ارادے کے ممکن نہیں۔ ارادے سے اختیار کا ثبوت ملتا ہے۔ عروج کرنے کے لئے محنت و حرکت ضروری ہے۔ سکون اس قوسِ عروجی کو قوسِ نزولی بنا دینے اور حیاتِ ابدی سے محروم کر دینے کی علامت ہے۔ اس حیاتِ مستعار میں جد و جہد لوازمۂ حیات ہے اور سکوت بدتر از موت۔ جب یہ حقیقت ہے تو دنیا میں کوئی عمل و حرکت کو مانے یا نہ مانے مگر صوفی۔ خواہ وہ کسی زمانہ اور

---

[1] از طریقِ زادن اے مردِ نکوے — آمدی اندر جہانِ چار سوے
ہم بروں رفتن بزادن می تواں — بندہا از خود کشادن می تواں
لیکن ایں زادن نہ از آب و گل است — داند آں مردے کہ صاحب دل است
آں ز مجبوری است ایں از اختیار — آں نہاں در پردہا ایں آشکار
زادنِ طفل از شکستِ اشکم است — زادنِ مرد از شکستِ عالم است
جانِ بیدارے چو زاید در بدن — لرزہا افتد دریں دیرِ کہن
(جاوید نامہ)

کسی مسلک کا ہو منکرِ عمل نہیں ہو سکتا۔ صوفی کے لئے جد وجہد لازمی شے ہے۔ بغیر جد وجہد کے وہ صوفی کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ "می تراشی و می خراشی" والا اصول صوفیانہ عمل کا بین ثبوت ہے۔[1]

ڈاکٹر اقبال نے جب آنکھ کھولی تو نئی سائنس اپنی خلاقی کی بہار دکھا رہی تھی اور اپنے اختیار سے مجبوریوں کو فنا کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ فلسفہ اس کا اتباع کر رہا تھا۔ چنانچہ مشاہدہ نے موازنہ پر آمادہ کیا۔ معلوم ہوا کہ موجودہ صوفی باطنی مجاہدہ کے ذریعہ روحانیت کی فضا میں اس قدر بلند پروازی کر رہا ہے کہ چشم سر سے دیکھنے والے انگشت بدنداں ہیں اور عقل اُس تک نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو اِن صوفیوں کی ظاہری نقل کر رہے ہیں وہ وبالِ حیات ہیں۔ نہ گھر کے اور نہ گھاٹ کے۔ اور شاید اِن ہی کی کثرت ہے اور اس قسم کے صوفیوں کی جد وجہد میں "انتم الاعلون" کا برملا ثبوت کہیں

---

[1] مردِ مومن زندہ و با خود بہ جنگ ۔۔۔ بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

نہیں ملتا۔ لہٰذا اُس نے یوں مرثیہ پڑھا۔

مسلماں ہے توحید میں گرم جوش ۔۔۔ مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدّن۔ تصوّف۔ شریعت۔ کلام ۔۔۔ بتانِ عجم کے پُجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔۔۔ یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب ۔۔۔ مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سُلجھا ہوا ۔۔۔ لُغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں فرد ۔۔۔ محبت میں یکتا۔ حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا ۔۔۔ یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بُجھی عشق کی آگ اندھیر ہے

مسلماں نہیں۔ راکھ کا ڈھیر ہے

سائنس کی مادّی ترقیاں تباہ کاریاں ہیں اور صوفی کی باطنی بلند پروازیاں، ویرانیاں۔ زینتِ دنیا نہ اِن سے اور نہ اُن سے۔ آفرینش کا مدعا زینتِ دنیا سے ہے۔ اس نقص کی وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ یکطرفہ کوشش ہے[1]

---

[1] شرق حق را دید عالم را ندید ۔۔۔ غرب در عالم خزید از حق رمید

چشم بر حق باز کردن بندگی است ۔۔۔ خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

مادہ و روح کا توازن[1] ہی دُنیا کی رونق بن سکتا ہے اور یہی ان دونوں جگہ مفقود ہے۔ یہ توازن اگر کہیں پایا جاتا ہے[2] تو حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ میں اور اُن کا سبق سیکھا جا سکتا ہے تو اُس رب اضداد کے کلام پاک سے جس کی قدرتِ مطلقہ اندھیرے سے اُجالا پیدا کرتی ہے اور اُجالے سے اندھیرا اور مُردہ سے زندہ بناتی ہے اور زندہ سے مُردہ لہٰذا قرآنی جدوجہد کا حکم ہے ؎

در کفے جامِ شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن (حافظ)

محض عقیدہ تندی کے زور پر نہیں کہا جاتا بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ تعلیم قرآن مدت قلیل میں ہر تہذیب و تمدن سے اپنا کلمہ پڑھوا چکی ہے اور نیا فلسفہ اس کی تائید کر رہا ہے چنانچہ اقبال نے

---

[1] جاں ز تن مارا ز جذب این و آں (جذب بر نو پیدا و جذب ما نہاں)

[2] اے خوشا آن قومے کہ جانِ او تپید از گلِ خود خویش را باز آفرید

قرآنی تعلیم کو اپنا لائحہ عمل بنایا اور اعلان کر دیا ؎

یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

اس سے یہ سمجھنا کہ تعلیمِ جد و جہد اقبال کی ایجاد ہے۔ صحیح نہیں۔ البتہ قرآنی جد و جہد کو ترقی یافتہ سائنس اور جدید فلسفہ کے طرز میں بیان کر کے ایک مخصوص نظریہ پیش کیا ہے اور بس۔ اور یہی اُس کا بے مثال کمال ہے۔

پرانے فلسفہ کے مطابق صوفیاء نے اپنی جہد و جہد ایک دائرہ کی شکل میں دکھائی ہے۔ فلسفۂ جدید اس کو خطِ مستقیم ثابت کرتا ہے۔ خطِ مستقیم اگرچہ دائرہ کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے مگر اس صورت میں بذاتِ خود خطِ مستقیم نہیں رہتا۔ دائرہ میں ابتدا و انتہا کا ملنا ضروری ہے اور خطِ مستقیم اور صراطِ مستقیم میں تجنیس و تشبیہ بالمعنی و بالصورت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال صوفیاء کے تخیل کے

خلاف "وصل" کے منکر ہیں[۱] اور تسلسل لامتناہی کے قائل[۲]۔ اُن کے نزدیک انسانی خودی مختلف اشکال و مدارج کو طے کرتی ہوئی خدائے لایزال کے حضور میں اپنی لایزالی کا ثبوت پیش کرتی رہتی ہے[۳]۔ اقبال کے نظریہ کے مطابق "حیاتِ ابدی" کی یہ نئی تشریح ہے۔

وصل کو اگر حیاتِ ابدی قرار دیا جائے تو کُل تماشے کا ایک نہ ایک روز خاتمہ ضروری ہے اور پھر وجودِ خداوندی کو نئی تخلیق کی

۱ے گذشتم از وصالے جاودانے | کہ بینم لذتِ آہ و فغانے

۲ے مجو پایاں کہ پایانے نداری | بپایاں تارسی جانے نداری

بپایاں نارسیدن زندگانی است | سفر مارا حیاتِ جاودانی است

بخود محکم گذر اندر حضورش | مشو ناپید اندر بحرِ نورش

جہاں در جلوہ گاہِ یار می سوز | عیاں خود را، نہاں اُو را برافروز

۳ے زندگی خود را بخویش آراستن | بر وجودِ خود شہادت خواستن

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن | خویش را دیدن بنورِ خویشتن

شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے | خویش را بینی بنورِ دیگرے

شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق | خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

پیشِ ایں نور ار بمانی استوار | حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار

ضرورت ہوگی۔ اس طرح مقصد آفرینش کے حدود مقرر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ نتیجہ قطعی لغو اور غلط ہے۔ برخلاف اس کے نظریۂ اقبال علماء ظاہر کی تائید کرتا ہے اور لقاے الٰہی کو حیاتِ ابدی سمجھتا ہے۔ مشاہدے کے مدارج کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ اس لئے مشہود لازوال کے ساتھ شاہد کی بقاء خود بخود ثابت ہے۔[1]

جد وجہد کا اصول ہر طبقۂ خیال میں مسلّم ہے۔ صوفیا جد وجہد کا خاتمہ بصورت وصل کرتے ہیں اور سفر کے لئے مقصد و مقام سے

[1] دلِ ما در تلاشِ باطلے نیست | نصیبِ ما غم بے حاصلے نیست
نگہ دارند اینجا آرزو را | سرور و ذوق و شوقِ جستجو را
خودی را لازوالے می تواں کرد | فراقے را وصالے می تواں کرد
چراغے از دمِ گرم تواں سوخت | بسوزن چاکِ گردوں می تواں دوخت
خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست | تجلی ہائے او بے انجمن نیست
اگر مائیم گرداں جامِ ساقی است | بزمش گرمئی ہنگامہ باقی است
مرا دل سوخت بر تنہائی او | کنم ساماں بزمِ آرائی او
مثالِ دانہ می کارم خودی را | برائے او نگہ دارم خودی را

(گلشن راز جدید زبور عجم صفحہ ۲۴۱ و ۲۴۲) ۱۲

قائل ہیں۔ علمائے ظاہر جدوجہد کا مآل لقائے الٰہی کو قرار دیتے ہیں اور اسی کو منتہائے سفر تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال لقائے الٰہی کے لئے جد و جہد کو مستقل اور مسلسل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

سفر اس کا آغاز و انجام ہے

علمائے ظاہر اور معتزلہ ازل میں واقعہ سجدہ کے بعد قیامِ جنت سے انسانی زندگی کی ابتدا سمجھتے ہیں اس لئے جنّت پر ہی انسانی زندگی کا خاتمہ کر کے داستان ختم کر دیتے ہیں۔ علمائے ظاہر جنت میں لقائے الٰہی کے قائل ہیں گویا کامیاب انسان خالق کی لقاء کی مسرّتِ لازوال سے محفوظ ہوتا رہے گا اور بس۔ معتزلہ لقاء الٰہی کے نہ اس زندگی میں قائل ہیں اور نہ اُس زندگی میں۔ صوفیاء ان دونوں سے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ وہ زندگیٔ انسانی کو واقعۂ سجدہ سے پہلے کی شئے سمجھتے ہیں اس لئے آخر میں جُز کو کُل سے ملا دینا لازمی سمجھتے ہیں اور اس طرح امتیاز خالق و مخلوق کو دُور کر دیتے ہیں اور اہمیت نہیں دیتے۔ اقبال ان تمام اصولوں سے ایک نئی بات پیدا کرتے ہیں یعنی اُن کے یہاں حیاتِ ابدی ایک

حرکتِ مسلسل کا نام ہے۔ خاتمہ عنقا ہے۔

نہ حد اس کی پیچھے نہ حد سامنے

اس اختلاف نے علمائے ظاہر کو "شہودی" بنا دیا۔ اور صوفیاء کو "وجودی"۔ "شہودی" بغیر کسی قسم کے اتحاد کے "توحید" کو خالص مانتے ہیں اور "وجودی" توحید میں اتحاد کے قائل ہیں اور اس کو شرک نہیں سمجھتے۔ ان دونوں کی بحثیں اس قدر دور از کار اور دقیق بن گئی ہیں کہ نہ عامی سمجھ سکتا ہے اور نہ اُن سے کوئی خاص فائدہ مترتب ہوتا ہے اور نہ اُن کا کچھ حاصل و وصول ہے۔ وجودی گروہ "ہمہ اوست" کا قائل ہونے کی وجہ سے ملزم قرار دیا جاتا ہے کہ عقیدۂ وحدت الوجود یونانی و ویدانتی فلسفہ سے مستعار لیا ہے لیکن نفسِ حقیقت پر غور کیا جائے تو "وحدت الوجود" سے انکار مشکل ہے گا بشرطیکہ حیاتِ ابدی محض جنت تک محدود نہ کی جائے۔ جنت سے تجاوز قرین عقل ہے اور جائز اس لئے کہ انسان کی ابتدا بہر حال قیام جنت سے پیشتر کی ہے اور بہت پیشتر کی ہے۔

"اہل شہود" "ہمہ از دست" کے قائل ہیں اور اُن کی توحید کا

بہترین استدلال خالق و مخلوق کے حدود ہیں۔ یہی امتیاز وحدت الوجود کی تردید کا باعث ہے۔ یہ امتیاز کبھی معنی رکھتا ہو تو رکھتا ہو مگر اب تو قطعی بے معنی سا ہے۔

"امر" کو "ذات" سے جدا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ "روح" "امر ربی" ہے جو مجسمۂ خاکی میں پھونکی گئی۔ لہٰذا جہاں تک "روح" کا تعلق ہے کہا جا سکتا ہے کہ "ذات" مخلوق میں جاری و ساری ہے۔ بس حقیقتِ وحدت الوجود بھی یہی ہے۔ مگر آگے چل کر جسم[۱] کی شمولیت مانع آتی ہے اس لئے کہ مادہ فانی ہے اور ذات باقی۔ لہٰذا یہ اجتماع وحدت کے منافی ہے۔

جدید سائنس نے اول اول یہ ثابت کر دکھایا کہ مادہ فانی نہیں ہے اس میں محض تغیر واقع ہوتا ہے جس کو عدم و فنا نہیں کہا جا سکتا اگر یہ صحیح ہے تو یہ مسلمہ مغالطے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ عالمِ امر،

[۱] اے کہ گوئی محمل جان است تن | سرِّ جان را در نگر برتن متن
محملے نے حالے از احوال اوست | محملش خواندن فریب گفتگو است
ایں بدن با جان ما انباز نیست | مشتِ خاکے مانع پرواز نیست

زمان و مکان سے آزاد ہونے کی وجہ سے جزوِ ذات ہے اور عالمِ خلق، زمان و مکان کی قید میں مبتلا ہونے کی وجہ سے جزوِ ذات نہیں ہے۔ اگر تغیر ہی وجہ امتیاز ہے تو سلسلۂ تنزلات، عالمِ امر میں بھی تغیر کا پتہ دے رہا ہے۔ لہٰذا جب عالمِ امر اور عالمِ خلق دونوں میں تغیر شامل ہے اور کسی شے کی فنائیت و عدمیت ثابت نہیں تو مادہ کو روح کی طرح جزوِ ذات سمجھنا ناجائز نہیں ہو سکتا۔ گویا وحدت وجود اس طرح ظاہر ہو گئی۔ لیکن یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ جدید سائنس کی آخری تحقیق نے مادہ کا تجزیہ کر کے ثابت کر دکھایا کہ مادہ کا خفیف ترین جُز جس کو ایٹم کہتے ہیں الکٹرون اور پروٹن سے مرکب ہے اور یہ دونوں بجلیاں ہیں۔ الکٹرون برق منفی ہے اور پروٹن برق مثبت پروٹن کی برقِ مثبت کے گرد الکٹرون کی برقِ منفی اُچھل اُچھل کر قربان ہو رہی ہے اور وجہِ حیات بنی ہوئی ہے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ مادے کی بناء برقِ منفی ہے تو مادّیت کا سوال خارج از بحث ہے اور قابلِ غور بھی نہیں۔ لہٰذا مادہ روحانیت پر بناء رکھنے کی وجہ سے وحدت وجود کے مانع نہیں آ سکتا۔ اب تحقیق کی روشنی میں

حجابِ حدود اُٹھ جانے کے بعد اہلِ شہود کو اپنے نظریہ کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ اثبات، نقص توحید ہے اور مکمل تصورِ توحید، وحدتِ وجود سے ہی ممکن ہے۔ برقِ منفی جب مادہ کی ابتدائی حقیقت ہے تو لا الٰہ الا اللہ کا پہلا لفظ لا اعلان کر رہا ہے فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

اسی دریا سے اُٹھتی ہے وہ موجِ تُندِ جَولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

اقبال کے معتقدین عرصہ تک گومگو میں مبتلا رہے بعض نے اس کو اہلِ شہود سے شمار کیا۔ بعض نے اس کو اہلِ وجود سے خیال کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال بذاتِ خود جس توحید کا قائل اور مبلغ ہے وہ اہلِ شہود کی توحید سے مختلف ہے اور جس وحدت الوجود کو وہ تسلیم کرتا ہے وہ اہلِ وجود کے وحدت الوجود سے علیحدہ ہے۔ رجحانات و اقدار کی تبدیلیوں کی وجہ سے اقبال نے نتیجۂ وصل کو چھوڑ کر وحدت الوجود والوں کے تمام رنگ اہلِ شہود کی ٹھوس توحید میں بھر دیئے اور اختلافات کو دُور کر کے دونوں میں اتحاد کی

راہ پیدا کر دی[1]۔ خالص چشمۂ توحید سے بے شمار توحیدیں اُبل پڑیں اور اصلِ توحید میں رتی برابر فرق نہیں آیا[2]۔ ان قطراتِ توحید کی عشرت دریا میں فنا ہوتا نہیں ہے بلکہ خود دریا بنتا ہے۔ بے شمار دریا قدرتِ توحید کے لامتناہی ہونے کی دلیل ہیں اور ہوئے شرک سے پاک۔ جب تک یہ چشمۂ توحید موجود ہے یہ بے شمار اور روز افزوں توحید کے دریا بھی بہتے رہیں گے یعنی خودیٔ خدا کے ساتھ خودیٔ انسانی بھی لازوال ہے اور جذبِ وصل کے سکون کے بجائے سلسلۂ سعی و عمل برابر جاری رہے گا۔ کل یوم ھو فی شان

اسلامی جد و جہد کے معنی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کے عہدِ تنزیل کی جد و جہد کو پہلے سمجھ لیا جائے، جس کی اصلاح اسلام لے کر ہے۔ فطرتِ انسانی میں خوف کا عنصر موجود ہے۔ بُت پرستی،

---

[1] نہ او بے ما۔ نہ ما بے او چہ حال است | فراقِ ما۔ فراق اندر وصال است
نہ بحرش گم شدن۔ انجام ما نیست | اگر او را تو در گیری فنا نیست
خودی اندر خودی گنجد محال است | خودی را عین خود بودن کمال است
خودی چوں پختہ گردد لازوال است | فراقِ عاشقاں عین وصال است

[2] اندریاں صد شعاعِ آفتاب | کم نمی گردد متاعِ آفتاب

آتش پرستی، یہودیت اور عیسائیت میں مختلف طرح سے اس فطری خوف کی نمایش موجود ہے۔ اگر اسلام خوف کی تائید کرتا تو اس کا غلبہ ممکن نہ تھا اور اگر علانیہ تردید کرتا تو کامیابی مشکل تھی۔ قرآن پاک نے اس فطری خوف کی باگ ماسوا سے ہٹا کر نہ صرف خدا کی جانب موڑ دی بلکہ اس خوف کا نام بھی بدل کر "اتقاء" رکھ دیا۔ اور پھر اتقاء کے منازل و مدارج میں خوف کو پرہیزگاری سے بدلتے ہوئے محبت کی منتہا تک پہنچا دیا یہی وہ خصوصیت ہے جو سوائے اسلام کے ہر جگہ مفقود ہے۔ چنانچہ سینہ ٹھونک ٹھونک کر بتایا گیا ہے

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون

اور فمن آمن واصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون

جس جد وجہد میں خوف نہ ہو اور محبت و عشق کی چاشنی ہو اس کے نتائج ہی انتم الاعلون کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور ایسے ہی مجاہد دس دس پہ بھاری ہوا کرتے ہیں۔

حیات جب سعی و عمل کا نام ہے تو امید کامیابی اس کی روح رواں ہونا چاہیئے۔ بغیر امید کی سعی جو کچھ بھی ہو مگر عمل صحیح نہیں کہی جا سکتی

ناکامیاں اس امید میں تزلزل نہیں پیدا کر سکتیں اور سلسلۂ سعی وعمل کو منقطع نہیں کر سکتیں اور اگر کر دیں تو اس کا نقص بیّن ہے۔ لہٰذا اسلام نے مایوسی کو حرام قرار دیا ہے اور نہایت شفقت آمیز طریقہ سے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی تلقین کی ہے اس تعلیم کو اقبال نے رجائیت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور یہ لازمۂ جدوجہد ہے۔ یہ تعلیم بھی خوف دُور کرنے کے علاوہ دوسری بیّن اور امتیازی خصوصیت اسلام ہے

اس سعی وعمل کے سلسلہ میں جبر و اختیار کا مسئلہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قدریوں اور جبریوں کے مباحث نے خون کے دریا بہا دیئے ہیں جبری کہتے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے اور قدری مدعی ہیں کہ انسان خود خالق افعال ہے۔ یہی قدری بعد کو معتزلہ کہلائے لطف یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کی سند قرآنِ پاک سے ہے۔ روح قرآن سے علیحدہ ہو کر جب غلط عینک لگائی جائے گی تو نتیجہ صحیح نہیں نکل سکتا۔ اور اس طرح جو تصویر نظر آئے گی وہ اصلیت کے علاوہ کچھ اور ہو گی

عمل وحرکت کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حرکت اُسی وقت وجود میں آتی ہے جب پیچھے سے کوئی ڈھکیلے اور آگے کو کوئی

کھینچے جب تک یہ دونوں اُمور نہ ہوں گے حرکت صحیح وجود میں نہیں آئے گی۔
انسان اپنی خلقی طبیعت، موروثی عادت اور تربیت و ماحول سے متاثر ہو کر آرزو کیا کرتا ہے۔ مقصد و منزل اس کو اپنی طرف آگے سے کھینچتے ہیں لہذا وہ عمل کرتا ہے۔ یعنی ایک قضا سے دوسری قضا کی طرف سعیٔ عمل ہوا کرتی ہے یہی قاعدۂ کلیہ ہے۔ اب قضائے ماضی اور قضائے مستقبل دونوں مجبوریاں ہیں لہذا کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے یہ صحیح ہے کہ فطرت ہر ہر شئے جاری ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ سنت اللہ میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کس نے کہا کہ فطرتِ اشیاء اور سنت اللہ دونوں ایک ہیں۔ بس ان دونوں کے فرق و اختلاف میں مجبوری غائب ہو جاتی ہے۔ اور اختیار کی شکل نمودار ہو جاتی ہے۔ یہی اختیار فطرتِ اشیاء اور سنت اللہ میں امتیاز کا باعث ہوا کرتا ہے۔
مولانا روم نے اس طرح مغالطہ صاف کیا ہے ؎

بال زاغاں را بہ گورستاں برد
بال بازاں را سوئے سلطاں برد

یہ دو بال تو وہی ایک ہیں مگر نتیجہ میں اختلاف ہے۔ تفکر و تدبر

بتاتا ہے کہ پر و بال کی فطرت تو پرواز ہے مگر سنت اللہ نے ایک کو گورستان پہنچا دیا اور دوسرے کو فلک الافلاک کی سیر کرا دی۔ فطرت و جبلت کو مہذب بنا دینا سنت اللہ کا کام ہے۔ فطرت کو مہذب بنا دینا منحصر ہے استعداد اشیاء پر جس کی وجہ سے بارِ امانت کو ایک نے قبول کیا اور بقیہ نے پناہ مانگی۔ لہٰذا فطرت اشیاء اور سنت اللہ کا فرق اس طرح ظاہر ہے۔ انسانی فطرت تو وہ تھی جس کی وجہ سے اُس کو ظالم و جاہل کہا گیا۔ اگر وہ اپنی فطرت پر کام کرتا تو حیاتِ ابدی کا کبھی مستحق نہ ہوتا۔ حیاتِ ابدی تو اُس کا حق ہے جو مہذب بن کر سنت اللہ کے مطابق کام کرے اور بارِ امانت کے فرائض کو پورا کر دکھائے۔

امانت ہر شے کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ ظالم و جاہل انسان نے اس کو قبول کر لیا۔ اس استعداد میں اختیار کی جھلک نظر آتی ہے اس بارِ امانت کی موجودگی میں جب آدم و شیطان نے ایک فعل کیا تو دونوں اپنی اپنی فطرت پر قائم تھے۔ آدم کی گندم خوری ظلم و جہالت پر مبنی تھی اور شیطان کی نافرمانی سرکشی کی وجہ سے تھی۔ امانت کے معیار کی وجہ سے دونوں پر یہ اعتراض کیا گیا۔ ایک نے سرکشی کی جا اسکی

فطرت کا تقاضا تھا لہذا راندۂ درگاہ ہوا۔ دوسرے نے بارِ امانت کو محسوس کر کے اپنی فطرت ظلم و جہالت پر شرمندگی کا اظہار کیا لہذا معاف کیا گیا شیطان اپنی فطرت سرکشی پر قائم رہ کر اور اصول امانت سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے آدم کو فریب دینے کی مسرت میں درخواست کرتا ہے کہ بہکانے کے لئے وہ تا حشر زندہ رکھا جائے۔ خداوند جل وعلیٰ اسکی درخواست کو قبول کرتے ہوئے نہایت وثوق و ناز کے ساتھ اعلان فرماتا ہے کہ اجازت ہے مگر تو میرے مخلص بندوں کا کچھ نہ کر سکے گا۔ یہ ناز و دعویٰ اُس قابلیتِ تہذیب کی بنا پر کیا گیا جو انسان کو مرحمت کر دی گئی ہے۔ جو انسان اس عطیۂ اختیار سے کام لے گا وہ مخلص شمار کیا جائے گا اور شیطان کی زد سے باہر ہو گا

انسان کا قصور یہ تھا کہ اس نے تہذیب و اختیار کو چھوڑ کر اپنی فطرت پر عمل کیا۔ بعد کو اپنے قصور پر شرمندہ ہوا۔ لہذا اپنی تہذیب و اختیار کی مشق کرنے کے لئے دنیا میں بھیج دیا گیا اور شیطان کو موقع دیا کہ انسان نے اپنی مہذب شدہ فطرت پر قائم رہنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کی آزمائش کرتا رہے۔ جو راسخ القول کامیاب ہو گا وہ

حیاتِ ابدی کا مستحق ہو گا

دیگر حشرات الارض کی طرح حیاتِ دنیوی کا خاتمہ نہیں ہونا چاہیئے تھا مگر شیطان کو معلم الملکوت ہونے کا امتیاز حاصل تھا اس لئے اس کو حشر تک زندہ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے بعد اس کا وجود اور اس کی شیطنت ختم۔ انسان حیاتِ دنیوی کے امتحان تہذیب میں کامیاب ہونے کے بعد حیاتِ ابدی کا مستحق ہے اور اس حیاتِ ابدی میں شیطان اور اس کی آزمائش سے کچھ واسطہ نہیں۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے کہ اُس کی جد و جہد ظلمت و جہالت کی طرف لے جائے مگر تہذیب کا منشار ہے کہ ظلمت و جہالت سے بچا کر ابدیت کی منزل تک پہنچائے۔ بس یہی حقیقت اختیار کے حدود کو نمایاں کرتی ہے انسان کے سامنے جس طرح دو قضائے ماضی ہوتی ہیں اُسی طرح دو قضائے آئندہ ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو اس کی فطرت مقرر کرتی ہے اور دوسری وہ جو مہذب شدہ فطرت یعنی سنت اللہ قائم کرتی ہے ان دونوں میں انتخاب کرنا اختیاری بات ہے اور اسی پر جزا و سزا کا انحصار ہے۔ اور اس طرح جبر و قدر کا

مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔[1]

علمائے ظاہر۔ صوفیائے صافی۔ اقبال۔ میں اور آپ، سب جد و جہد۔ جنبش و حرکت اور سعی و عمل کے قائل ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ عمل صالح بذات خود ہے کیا؟ قرآن نے عمل کرنا سکھایا۔ عرب کی قیاسی عقیدہ مندی کو صحیح تعمیل عمل میں تبدیل کر دیا اور ان کو آفتاب بنا کر چمکا دیا۔ کمال عمل حاصل کرنے کے بعد عرب کی شکست خوردہ ذہنیت پھر عود کر آئی اور وہ اپنے پرانے توہمات و ظنیات کو زندہ کرنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یونانی فلسفہ، ہندوستانی عقائد اور ایرانی توہمات نے عرب کو اور بھی شہ دی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مسائل اپنی جگہ مناسب و ضروری ہیں۔ مگر تدوین حدیث و فقہ کو اور دیگر دور از کار مباحث کو

---

[1] تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں ۔۔۔ ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں ۔۔۔ مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی
ضمیر زندگانی جاودانی است ۔۔۔ بچشم ظاہرش بینی زمانی است
چہ گویم از چگون و بے چگونش ۔۔۔ بروں مجبور و مختار اندرونش
زجبر او حدیثے درمیاں نیست ۔۔۔ کہ جاں بے فطرت آزاد جاں نیست

اصلی تعلیم قرآن سمجھا جانے لگا اور فروعات میں مبتلا ہونے کی وجہ سے حقیقت نظر انداز ہو گئی۔ عرب و عجم کی عقل پر جب پردے پڑ گئے تو قرآن کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے کے بجائے عمل پڑھنا شروع کر دیئے اور اسی کو عمل صالح خیال کیا جانے لگا۔ قرآنی عمل صالح کے نتائج بھی اظہر من الشمس ہیں اور ان کو ترک کر دینے کا حشر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے لہٰذا نہایت بے باکی اور بغیر کسی تکلف کے بہ بانگ دہل بتایا جا سکتا ہے کہ خدا کے رنگ میں رنگ کر فطرت کو سمجھ لینے کا نام عمل صالح ہے بندگی میں خدائی کرنے کو عمل صالح کہا جاتا ہے اور اس کی تعلیم قرآن پاک اور اسوۂ حسنہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

ہر عمل سے پہلے علم ضروری ہے۔ علم صحیح وہ ہے جو آنکھ، کان اور فواد سے حاصل ہوتا ہے۔ آنکھ اور کان کی شہادت علم کو گمراہ بھی کر سکتی ہے لیکن اگر فواد یا قلب اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کر رہا ہے تو آنکھ اور کان کی شہادت قابلِ اعتبار ہے۔ قلب کو اصلی کام پر لگانے کے لئے اُن تمام اُمور کی فراہمی ضروری ہے جو قرآنی الفاظ میں اوامر و نواھی کہلاتے ہیں اور جن کی تشریح "ضبط نفس" کے تحت میں اقبال نے

کی ہے۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بغیر تزکیہ کے صحیح قسم کی تعمیل ممکن نہیں۔ صوفیاء نے اپنی تمام تر توجہ اسی طرف متوجہ کر دی ہے اس کا مصرف ان کے یہاں مختلف ہے اور محدود ہے۔ وہ اعمال ظاہری کو ترک کر کے اعمال باطنی کی تکمیل کرتے ہیں اور بس

ضبطِ نفس، تزکیہ یا اوامر و نواہی کی تکمیل کے بعد آنکھ اور کان کی شہادت کا جب صحیح علم حاصل ہو جائے گا تو اس علم کا مقسوم عمل صالح کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ ضبطِ نفس اور تزکیہ سے وہ اختیار حاصل ہوتا ہے جو انسان کو اس کی جبلت ظلم و جہالت سے باز رکھتا ہے اور اس کو فطرتِ مہذب شدہ کی طرف لے جاتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ میں لا اعلان نفی ہے مگر یہ نفی یونانی اور ویدانتی نفی سے مختلف ہے۔ اس لا کا مدعا نفی نفس نہیں بلکہ غیریت ذات کی نفی اس کا مقصد ہے یہ لا نفس کو بعد تزکیہ تخلقوا با خلاق اللہ سے مزین کرتا ہے اور شرک سے محفوظ و مامون بناتا ہے اگر ان جملہ نفیوں میں کسی جگہ اشتراک و اشتباہ ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سب ایک ہیں۔ وحدت الوجود پر سب کا اتفاق ہو جاتا یہ نہیں بتاتا کہ ان میں فرق نہیں رہا۔ یہ متفق ہونا بھی

اتفاق کی علامت نہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا وحدت الوجود کے متعلق بھی مختلف طریقہ و معیار ہے

انسانی انجام و وسط کی تشریح کی جا چکی اب آغاز کی وضاحت ضروری ہے تاکہ اس کل کی حقیقت پر روشنی پڑے اور وسط و انجام سے رشتہ مل جائے

یہ کل کائنات وجودِ مطلق کی خود نمائی یا ارادۂ الٰہی کی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ ہے۔ ارادۂ الٰہی نے لفظ "کُن" کہہ کر جنبش کی اور یہ جنبش خود بخود محرک ہو گئی مختلف جنبشوں کی۔ اور اس طرح سلسلۂ لامتناہی وجود میں آگیا۔ جنبش ما بعد نہ مولود ہے اور نہ جزو بلکہ بذاتِ خود ایک نتیجہ النسبتی ہے ارادۂ الٰہی نے حرکت کی۔ اس کی ٹھیس کا اثر معلوماتِ الٰہی کے نام سے موسوم ہوا اور ان کی حرکت سے دوسری حرکتوں کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اگر تحریک نہ ہوتی تو معلوماتِ الٰہی کا وجود کیسے ہوتا اور وہ تعمیلِ حکم کیسے کرتے

اسی طرح عالمِ امر سے عالمِ خلق تک جملہ منازل حرکتِ اولیٰ کی جنبش کے سلسلے ہیں۔ جن کی عینیت ان کی غیریت میں مخفی ہے یعنی جو اصل کی خصوصیات رکھتے ہیں اور بظاہر اصل سے مختلف اور علیحدہ معلوم ہوتے ہیں

ذات واجب تعالیٰ، وحدتِ مطلقہ ہے جس کو "لا بشرطِ شئے" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہونے اور نہ ہونے کی قید نہیں۔ اور چونکہ وہ ہر شے سے بے نیاز ہے اس لئے وہ غنیِ مطلق بھی ہے۔ یہ احدیتِ ذات صرف تصور میں باعتبارِ ذہن خیال کی جاتی ہے اس لئے اعتباری ہے۔

جب احدیت نے وحدیت میں تنزل فرمایا یا بہ اصطلاح اصولِ حرکت احدیت وحدت کا باعث بنی تو یہ حرکت قیدِ سلبی میں آگئی۔ قیدِ سلبی کے لئے وجود کی ضرورت نہیں۔ واحدیت صرف اعتبارِ ذہنی اور مصنوعاتِ عقلی سے سمجھی جاتی ہے۔ اور اس میں کسی قسم کا امتیاز بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہی واحدیت تعینِ اول۔ نورِ محمدی۔ قلم یا فکر کے مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

تعینِ دوم کو ملکوتی کہتے ہیں۔ اس حرکت میں ماہیات کی وجہ سے امتیاز نمایاں ہے۔ مگر صورت و شکل کا پتہ نہیں۔

تیسرا مرتبہ برزخ یا عالمِ مثال کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں صورت و شکل بھی پائی جاتی ہے لیکن تغیراتِ جسمانی نہیں ہوتے۔

چوتھا درجہ عالمِ شہادت یا ناسوت کہلاتا ہے جہاں صورت و شکل کے کے ساتھ تغیرِ جسمانی بھی دکھائی دیتا ہے اور یہ عالمِ جسمانیات متغیر ہونے کی

وجہ سے حرکت کو مادی شکل میں پیش کرتا ہے۔

جب یہ مادی حرکت شکلِ پنجم میں جلوہ نمائی کرتی ہے تو ظہورِ انسانِ کامل کی شبیہ اختیار کر لیتی ہے، جو کُل عوالم اعلیٰ کا مظہر ہے

عالمِ غیب یا عالمِ امر، عقول و نفوس و ارواح کا مقام ہے اور عالمِ شہادت یا عالمِ خلق مادہ و مدت کی جگہ ہے لہٰذا قیدِ زمان و مکان میں مبتلا ہے

بہر حال ان سب حرکاتِ ارتقائی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حرکتِ اولیٰ کی سلسلہ جُنبانی سے ایک مسلسل لرزش وجود میں آگئی جس کو خلقت کہا گیا۔

ذاتِ مطلق اگر حرکتِ اولیٰ ہے تو تعینِ اول کو حرکتِ ثانی ہی کہا جا سکتا ہے۔ حرکتِ اولیٰ اور حرکتِ مابعد کا تعلق ہوئے شرک سے پاک ہے اور توحید کے منافی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ حرکتِ ثانی کی وجہ سے حرکتِ اولیٰ میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اور وہ حرکتِ ثانی اپنے آپ کو حرکتِ اولیٰ کی برابری اور شرکت کی مدعی ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی تو اسی طرح توحید میں نقص کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر چراغ کی مثال میں دوئی نمایاں ہے لیکن حرکت سے

جب حرکت وجود میں آتی ہے تو اس میں دوئی، تقسیم، تفریق یا تولید کا گمان بھی نہیں گذرتا۔ لہٰذا توحیدِ خالص سے جب مختلف توحیدیں ظہور میں آتی ہیں تو توحید کے مکمل و خالص ہونے میں ذرا فرق نہیں آتا فلسفۂ قدیم نے اس حقیقت کو یوں ظاہر کیا ہے کہ وجودِ ذات ہر شے میں جاری و ساری ہے فلسفۂ جدید بزبان اقبالؔ یوں بیان کرتا ہے کہ حرکتِ مسلسل کا تام وجود ہے طریقۂ اظہار یہ ہو یا وہ ہو مگر وحدت الوجود دونوں طرح ثابت ہے۔ تخیلِ قدیم میں غیریت کی جھلک پائی جاتی ہے اور اسی غیریت کی جھلک نے توحید کے تصور کو منتشر و پراگندہ کر کے بحث کے ہزاروں دروازے کھول دیئے فلسفۂ جدید کے مطابق اقبالؔ نے حرکت کی مثال دے کر نہ صرف غیریت کو معدوم کر دیا بلکہ عینیت کو برملا اور بے لاگ دکھا دیا

حرکتِ اولیٰ یا لافانی وجود کا اگر علم نہ ہوتا تو اس کو تسلیم کرنے والا کون تھا۔ وجود کی شناخت علم سے ہوئی۔ لہٰذا وحدت الوجود کے فلاسفہ نے تمام تر توجہ علم کی طرف منعطف کر دی اور قعرِ سمندر سے ڈرِ بے بہا نکال کر دکھا دیئے یہ کوشش بجائے خود قابلِ آفریں ہے لیکن ارادۂ الٰہی اگر

جنبش نہ کرتا تو یہ علم کہاں ہوتا۔ بعض علماء نے اس حقیقت کے پہلو پر بھی غور کیا لیکن وہ سبب و نتیجہ اور علت و معلول کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو کر مبداء سے بے نیاز ہو گئے اور منکرینِ خدا کہلائے۔ جنھوں نے علم کے ذریعہ وجود کا پتہ لگایا تھا انھوں نے علت و معلول کے معتقدین کو سمجھایا تو وہ علت العلل کے قائل ہو گئے مگر پھر وہ اس استدلال میں ایسے کھوئے گئے کہ مقصد و نتیجہ پر پہونچنے کے بجائے کہیں سے کہیں نکل گئے۔

ارادہ ایک حرکتِ عمل ہے جو ذاتِ بے ہمتا سے ظہور میں آئی۔ اس حرکتِ یقینی کی صفت و شان ہے امر و خلق۔ عرفِ امر لامکانی و لازمانی ہے جو حرکتِ خلق کی صورت اختیار کرنے پر مکانی و زمانی بن گئی۔ وجودِ حرکت ہر جگہ اور ہر تغیر میں ایک ہی ہے۔ صاحبِ ارادہ جل شانہٗ کے تمام صفات و شیون میں (جن کی تشریح قرآنِ پاک نے کی ہے اور جن کی تفصیل فلسفۂ وحدت الوجود نے بتائی ہے) قوتِ ارادہ اور قوتِ امر فوقیت و امتیاز رکھتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ارادہ و امر میں حرکت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ذاتِ مطلق خصوصیت کے ساتھ

متصف بہ حرکت ہے۔ اس ذاتِ مطلق کو حرکتِ مطلق یا حرکتِ اولیٰ کہنے میں کسی قسم کا کفر و شرک نہیں بلکہ توحیدِ خالص کا واضح اظہار ہے۔ اس صورت میں سورۂ اخلاص کی بغیر کسی ابہام کے اس سے بہتر اور کیا تشریح ہو سکتی ہے۔

یہ انائے مطلق، علم و عمل اور حیات و ادراک کی تحریکِ اولیٰ ہے۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے حی و قیوم ہے۔ ماہیت کے لحاظ سے روح ہے اور حرکت۔ اس کی احدیت لاتناہی اور غیر محدود ہونے کی وجہ سے زمان و مکان سے اعلیٰ ہے۔ هوالله احد۔ احدیت ایک نقطہ ہے جس کا نام ہے مگر نشان نہیں۔ ایک سرچشمہ ہے جس میں عمق ہے مگر گھیر اور پھیلاؤ نہیں۔ اس نقطہ و سرچشمہ سے تمام حیات اور خودیوں کا سلسلہ جاری ہوتا ہے اور اس شان کے ساتھ کہ خود جملہ سلسلوں سے بے نیاز ہے اور علیحدہ۔ مُنہ سے نکلنے والی مسلسل آواز کے حلقے ایک دوسرے سے غیر متعلق بھی ہوتے ہیں اور ایک نسبتِ مشترک بھی رکھتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک حلقہ دوسرے حلقہ کے اندر سے گذر کر آگے نہ بڑھے۔ الله الصمد۔ یہی صمدیت ہے اور اسی سے

یہ ثابت ہے کہ اس کی شان لم یلد ولم یولد ہے۔ ارادۂ امر و خلق انھیں اوصاف کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ وہ خود غیر محدود لامتناہی اور مختار ہے اور اسی کی حرکت سے ایک مسلسل حرکت جاری ہوئی ہے جو ہمیں بصورتِ خلق مبتلائے زمان و مکان دکھائی دیتی ہے۔

ذاتِ مطلق کو حرکتِ مطلق سے متصف کرنے کا پورا لطف و ذوق وہی اہلِ علم اٹھا سکتے ہیں جن کو نیوٹن کے "قوانینِ حرکت" پر عبور ہے۔ میں بہ خیالِ طوالت اس ضروری تشریح کو فی الحال نظر انداز کرتا ہوں۔

روح امرِ ربی ہے اور امر، ذات سے جدا اور مختلف نہیں لہٰذا روح میں صفاتِ رب ضرور ہونا چاہئیں۔ آمریت کی شان اگر روح میں نہ پائی جائے تو اس روح کو روح نہیں کہا جا سکتا۔ ذاتِ مطلق اور حرکتِ اولیٰ میں آزادی و مختاری مسلم ہے۔ چنانچہ ہر شے ایک قاعدہ پر ہے، ہر اصول میں جدت اور ہر قانون میں استثنیٰ ہے۔ کبھی اضداد سے محبت کی بو آتی ہے۔ کبھی اتحاد میں منافرت نظر آتی ہے۔ انائے مطلق کی یہی شانِ آمریت ہے۔ انائے مقید میں بھی حسبِ استعداد

اسی قسم کی شانِ آمریت کا ظہور لازمی و ضروری ہے۔ حرکتِ ثانی جس قوت و استعداد کے ساتھ وجود میں آئی ہے اسی کے مطابق باقی و جاری رہے گی مگر اس قوت کی کبھی نہ کبھی حد ہونا چاہیئے لہٰذا اسکا خاتمہ یقینی ہے مگر حرکتِ ثانی میں جو استعداد ہے اُسی استعداد سے کام لے کر وہ اپنی حد کو طویل و وسیع کر سکتی ہے اور شانِ آمریت اس استعداد میں نت نئی زندگی پیدا کرنے کی مدعی ہے۔ جنبش کا قاعدہ ہے کہ سکون سے پہلے خفیف سے اشارے پر مزید جنبش کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے جب اس صورت سے سلسلۂ حرکت جاری ہو گیا تو تغیر و بقا اس کا یقینی حق ہے۔ قرآن پاک بھی اسی آمریت سے پیدا ہونے والی بقاء کی ترغیب دیتا ہے اور اس بقاء کے حصول کے لئے مسلسل و متواتر صحیح جد و جہد لازمی ہے۔ نت نئی ترقی کرنے والی خودیٔ مقید کا مقدر یقینی بقائے دوام ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے جب اس خاک کے پتلے میں اپنا امر شامل کر دیا تو آثارِ حیات نمودار ہو گئے، شیونِ خداوندی کا وہ حامل ہو گیا وہ امر و تخلیق کا مکمل ترین نمونہ کہلایا۔ اشرف المخلوقات کا خطاب ملا

خودی سے مزین ہوا اور اس کی بنا پر بارِ امانت کی حامی بھرنے کے بعد خلیفۃ اللہ فی الارض کے لقب سے ممتاز و مشخص ہوا

جملہ اشیاء نے جس بارِ امانت کو قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ رکھے اور جس کو آمریت کا حامل ہونے کی وجہ سے ظالم و جاہل مگر صاحبِ خودی انسان نے اُٹھا لیا وہ بارِ امانت تھا کیا؟ اس کو عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نئی اصطلاح میں خودیٔ مطلق سے خودیٔ مقید کی نسبت کو قائم و استوار رکھنے کا نام بارِ امانت ہے اور غالباً عشق کی تعریف بھی یہی ہے۔ یہ نسبت مشترک یقیناً امرو روح کی پیدا کردہ ہے۔ حرکت مقید اگر حرکت مطلق سے محبت و نسبت قائم رکھے گی تو اس کو تخلقو باخلاق اللہ کا عامل سمجھا جائیگا ورنہ غلط استعمال پر نتیجہ بھگتنا پڑے گا تا آنکہ نسبتِ صحیح حاصل ہو جائے اور نسبتِ صحیح کے ذریعہ اپنے وجود کی بقاء سے لافانی وجود کا مسلسل کلمہ پڑھا جائے اس ذوقِ دید میں خاتمے کا تصور توہینِ خداوندی ہے اور بس

فاعتبروا یا اولی الابصار

میل ملاپ

(مطبوعہ ہندی اخبار ورتمان ۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء)

بنارس میں مندروں کے بیچ میں مسجد ہے اور مسجد کے آس پاس مندر ہیں یہ نظارہ ہر شخص کو دکھائی دے جاتا ہے جو بنارس جائے مندروں کے کلس خدائے واحد کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور مسجد کے مینارے اُسی کی طرف انگلی اٹھا رہے ہیں۔ دونوں کا مطلب و مقصد ایک ہے۔ انگریزی تاریخ لکھنے والے جو مذہب سے تعلق نہیں رکھتے اورنگ زیب کے تعصب کی کہانی سُنا رہے ہیں کہ مندروں کے بیچ میں مسجد بنوادی اور مذہب پرست آنکھیں بند کر کے ان دشمنوں کے کہنے میں آکر ان کی بات سُن رہے ہیں اور اصل مقصد کو کھوئے چلے جاتے ہیں۔ اچھا یہ تعصب کی داستان مان لی جائے مگر اس کو کیا کہا جائے گا کہ بھیروں کی لاٹ ایک مسجد کے اندر ہے جہاں دونوں مذہب والے اپنے اپنے وقت پر اپنی اپنی عبادت کر لیتے ہیں۔ نہ مندر کے

گھنٹے کسی کو ناگوار ہوتے ہیں اور نہ مسجد کی اذان سے کوئی بھڑکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہو گیا ہے کہ آج یہ پوجا اور عبادت پولیس کی نگرانی میں ہوتی ہے اور جھگڑا نہ ہونے کا سہرا پولیس کے سر بندھتا ہے۔ وہ کون سا مذہب ہے اور وہ کون سا فرقہ ہے جس کو بنارس اپنی گود میں جگہ نہیں دیتا۔ بنارس کے دل کی وسعت غور کرنے کے قابل ہے۔ تعصب کی داستان بابائی پی کر بھلے ہی بیان کی جائے لیکن بنارس کی ہمہ گیری اس کو غلط ثابت کرنے کو تیار ہے۔ تعصب کی داستان بیان کرنا تصویر کا محض ایک رخ ہے۔ یکطرفہ رائے کبھی درست نہیں ہوتی۔ اگر دوسرا پہلو بھی دیکھا جائے تو مندروں کے بیچ مسجد اور مسجد کے اندر بھیروں کی لاٹ میل ملاپ کا بہترین سبق ہے۔ نقطۂ نظر اگر صحیح ہے اور عبادت کی نیت پکی ہے تو ایک ہی مالک کی پوجا کرنے والوں میں جھگڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ عبادت کا طرز مختلف سہی مگر مالک تو ایک ہی ہے۔ اب اگر جھگڑا ہو تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ جھگڑا کرنے والے مالک کو نہیں پہچانتے ہیں۔ گمراہ کرنے والے عقل کی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور عبادت چھوڑ کر

فضول بکواس میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ مذہب یقیناً بیر رکھنا نہیں سکھاتا
اب جو جھگڑا ہوتا ہے اس کی وجہ کچھ اور ہو سکتی ہے مذہب نہیں ہو سکتا
اصل وجہ چھوڑ کر مذہب کی آڑ میں جھگڑا کر دینا یہ نئی تعلیم اور نئی پالٹکس کا
کام ہے۔ جھگڑے کی اصل وجہ بیکاری ہے۔ کاشی خدا کی عبادت کا
مرکز بن کر پہلے ہی دن سے بیکاری کو دُور کرنے کی فکر کرتی رہی ہے۔
وہاں اس قدر کام کاج کی کثرت ہے کہ بیکاری باقی ہی نہیں رہ سکتی۔
اب جو محنت نہیں کرنا چاہتے یا اپنی دولت کو غلط اور فضول خرچی میں
لٹا رہے ہیں ان کو کچھ نہ کچھ کارستانی چاہیئے اور اُن کے لئے صرف ایک
یہی بیکاری کا مشغلہ ہے کہ وہ ہر وقت تُو تُو مَیں مَیں کریں۔ اصلی اور سچے
انسان کا کام ہے کہ خوب محنت کرے۔ خوب کمائے اور جو جس کی کھائے
اس کی گائے اور مالک کا شکر ادا کرے۔ بیکاری کو دُور کرنا اور آپس میں
مل جُل کر رہنا بنارس کی بندگی کا ہمیشہ سے مقصد رہا ہے تاکہ دل
کھول کر انسان اپنے پیدا کرنے والے کی خدمت کر سکے۔

کانگرس سرکار نے بیکاری کو دُور کرنے کی سیکڑوں تدبیریں نکالی ہیں
صنعت و کاریگری کا محکمہ اس بیکاری کا علاج ہے جب سب اپنے اپنے

کام میں لگ جائیں گے تو لڑائی جھگڑے کی فرصت ہی نہ ملے گی
کام پورا کر لینے کے بعد مالک کا شکر ادا کرنا ضروری ہے اور اسی کا
نام عبادت ہے۔ جب ایسا ہو جائے گا تو بنارس کا مقصد پورا
ہو جائے گا وہ برابر یہی تعلیم دیتی رہی ہے جملہ مذہب والوں کو
بنارس کا مقصد ٹھنڈے دل سے سمجھنا چاہیئے۔ اگر انھوں نے
سمجھ لیا اور اس پر عمل کیا تو ضرور

بچھڑے ہوئے مل جائیں گے یہ چند دن کی بات ہے

کوئی سمجھے یا نہ سمجھے

(مطبوعہ سرپنچ لکھنؤ دسمبر ۱۹۴۶ء)

جب سے ہندی شاگرد اقبال نے رومی استاد کے اصول کو بدل کر کہا ہے۔ "چشم و گوش و دل کشا اے ہوش مند"۔ ہم نے سننا اور دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ سمجھنے کی نوبت ابھی نہیں آئی ہے۔

ہم نے سُنا "جواہر لال" کہتے ہیں۔ ہندوستان میں دو بڑی جماعتیں ہیں۔ "کانگرس اور گورنمنٹ" اور "مسٹر جناح" کہتے ہیں "ہندوستان میں تین بڑی جماعتیں ہیں، کانگرس، گورنمنٹ اور مسلم لیگ" تو ہمارے کان کھڑے ہو گئے

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس دو تین کا قضیہ اونٹ کو کسی کروٹ نہیں بیٹھنے دیتا۔ کانفرنسیں ہوئیں۔ کیبنٹ مشن آیا۔ لیڈروں نے لندن تک پرواز کی۔ کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی بنائی گئی۔ لیکن بجسف

وہی باقی ہے۔ کہ زلیخا مرد تھی یا عورت۔ آزادی مدعا ہے، اور آزادی، خوراک اور پوشاک کی ارزانی و فراوانی سے سمجھی جاتی ہے مگر یہاں یہ دکھائی پڑتا ہے کہ کھانے پہننے کی تکلیف ہر طرف جان تک محفوظ نہیں۔ کیا واقعی یہ آزادی کی علامت ہے اس میں شک نہیں کہ آزادی بغیر خون بہائے نہیں ملا کرتی۔ مگر یہ سر پھٹول جو ہو رہی ہے آزادی کی دشمن ہے۔ اس طرح جان کا کھیل کھیلنا۔ جنون اور پاگل پن کے حرکات کرنا۔ چھرے بھونکنا، پتھر مارنا، بچوں کو قتل کرنا۔ معصوم عورتوں پر ستم ڈھانا، بھائی بھائی کے درپے ہونا اور گھر پھونک تماشا دیکھنا نہ کسی تہذیب میں جائز ہے اور نہ کسی اخلاق میں روا ہے ان فضولیات سے بھلا گھر بسا کرتے ہیں۔ اب تو آنکھ کھل جانا چاہیئے۔ کون نہیں جانتا کہ ہم ایک تھے۔ اس مصنوعی آزادی نے ہمیں کئی کر دیا۔ دو ہوئے تین کہلائے، اور اب گروبنگ میں خدا جانے کتنے ہو جائیں۔ یہ تقسیم تو ہمیں شمار ہونے کے قابل ہی نہیں رکھے گی اور ہم کسی گنتی میں نہ ہوں گے۔ دوش کے آئینہ میں فردا کو دیکھنا

ضروری ہے تثلیث پر توحید نے فتح پائی ہے۔ ایک ہو جانا ہی زندگی کی علامت ہے۔ ان دو اور تین کی بحثوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاک ڈال دینا چاہیئے۔

مگر سوال یہ ہے کہ ہم ایک کیسے بن جائیں

اس قسم کے ہچکولوں نے کبھی ہوشیار کر دیا اور دماغ نے پریشان ہو کر دل کو روشن کر دیا تو ہمیں سمجھنا آ جائے گا جب ہم سمجھنے لگیں گے تو ہمارا لیڈر سلیم شاہی اور شیر شاہی کو چھوڑ دے گا۔ اختلاف رائے کا مذاق اُڑانے کے بجائے سنجیدگی سے مفہوم سمجھا جائے گا اور ہیر پھیر کے بغیر ناک پکڑنے کی کوشش کی جائے گی

جب ہم میں احساس اور شعور پیدا ہو جائے گا تو آپ خود بخود پروسیشن اور جلوس کی قطعی ممانعت کر دیں گے۔ تمام فتنہ و فساد کی جڑ یہی جلوس بن جایا کرتے ہیں۔ نیکی برباد گناہ لازم ہمیشہ کے لئے نہیں تو چند سال کے لئے جلوس کی ممانعت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ پھر معلوم ہو جائے گا کہ جو مقصد

جلوس کا ہے وہ مخالفت کے بعد کس قدر زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ چھوت چھات کو ہم اب بھی بُرا سمجھتے ہیں۔ آیندہ باشعور ہو کر اس بلا کو ہم اس طرح ختم کر دینا چاہتے ہیں کہ کسی کی پیشانی پر بل نہ آئے۔ اور چھوت چھات کا لفظ لغت سے بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائے۔ جب ہم میں تمیز آ جائے گی تو مذہب کی ہر بہترین صورت سے تکمیل کریں گے۔ رسمیات نے جو مذہب کے نام پر بٹہ لگا دیا ہے ان کو علیحدہ کر کے خالص مذہب کے سچے احکام کی تعمیل ضروری ہو گی۔ وہ بھرتی کی باتیں جو مذہب کو بدنام کرتی ہیں زیادہ نہیں چند ہیں:۔ (۱) باجے گاجے کو خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو مسجد اور مندر کا ادب کرنا چاہیئے۔ یا مسجد اور مندر کو صحیح معنوں میں اس قدر معزز بنا دیا جائے کہ ان فضولیات کو نگاہ غلط انداز سے بھی نہ دیکھیں۔ (۲) اذان کو نہ سنکھ سے ڈرنا چاہیئے اور نہ سنکھ سے اذان کو نفرت کرنا چاہیئے کیونکہ دونوں ایک ہی حقیقت و حقانیت کے اعلان کی مختلف شکلیں ہیں۔ (۳) گاڑے کے متعلق کنٹونمنٹ اور سول آبادی

دونوں میں ایک ہی قانون ہونا چاہیئے یا دونوں جگہ بند یا دونوں جگہ اجازت، عالیشان بہتری کی خاطر نہ بند کرنے میں نقصان ہے اور نہ اجازت میں فائدہ۔ بہر حال اس کے متعلق تعصب اور ضد کو کام میں نہیں لانا چاہیئے۔ کہتے ہیں ہر تہذیب کا خاتمہ تخریب پر ہوتا ہے اور تخریب کی انتہا تہذیب پر ہوتی ہے۔ خوشی اور رنج دونوں توام ہیں جو خوشی کی انتہا ہے وہ رنج کی ابتدا ہے مرزا داغ مرحوم نے کتنے مزے کی بات کہی ہے

ع۔ جس کا انجام ہو اچھا وہ مصیبت اچھی

اگر موجودہ فتنہ و فساد صلح و آشتی کا پیش خیمہ ہے تو حقیقت میں اختلاف رحمت ہے۔ کیسے دو اور کیسے تین۔ ہم پیشین گوئی کیے دیتے ہیں کہ ہندوستان میں کوئی جماعت نہیں بس ایک قوت ہے جو امن و امان کی حامی، حافظ اور ناصر رہے گی

ممبروں کے حقوق

(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے فروری سنہ ۶۲ء میں براڈکاسٹ کیا)

قدرت کاملہ نے ریڈسی (RED SEA) اور میڈیٹیرینین کو علیحدہ علیحدہ دو سمندر بنایا تھا۔ انسان نے نہر سویز نکال کر دونوں کو ملا دیا۔ فطرت نے مخلوق میں کمزور و طاقتور اور حاکم و محکوم کی تفریق کی تھی۔ انسان نے ممبر پیدا کر کے دونوں کو ایک کر دیا یہ حرکتیں انسان نے فطرت سے سیکھی ہیں۔ جانوروں کی دنیا میں ایک ایسا جانور فطرت نے پیدا کیا ہے جو چرند بھی ہے اور پرند بھی مگر اس جانور کو چونکہ کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اسے کوئی بھی اپنے گروہ میں شامل نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ممبر کو اختیار حاصل ہے اور اس کے دونوں میٹھے ہیں۔ اختیار اور حقوق ممبر کی دوہری شخصیت میں چار چاند لگا دیتے ہیں اور وہ حاکم و محکوم دونوں کی آنکھ کا تارا ہے

یہ حقوق جن کی وجہ سے ممبر تمام جانوروں میں ممتاز ہے اِنے گنے چند ہیں جو اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان حقوق میں ربڑ کی سی خاصیت ہے وہ بڑھ بھی سکتے ہیں اور سُکڑ بھی سکتے ہیں۔ اس لچک سے ممبر کی طاقت و ہمت کا امتحان ہو جایا کرتا ہے۔ ممبروں کے حقوق اگرچہ بہت تھوڑے ہیں مگر اُن کے فرائض کی کوئی انتہا نہیں حقوق اور فرائض سے مل کر ایک ایسا مرکب بنتا ہے۔ جس میں ایک کو دوسرے سے جُدا کرنا مشکل ہے۔ ہر چہ در کان نمک رفت نمک شد اس مرکب کے تین ٹکڑے کئے جا سکتے ہیں یعنی اس توحید میں تثلیث پائی جاتی ہے ایک وہ جو لیجسلیچر سے تعلق رکھتے ہیں دوسرے وہ جو بیرونی دنیا سے متعلق ہیں اور تیسرے وہ جو لیجسلیچر کے اندر اور باہر دونوں پر مشتمل ہیں

لیجسلیچر کے باہر والے حقوق محض چلیت پھرت پر منحصر ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ممبر خدائی فوجدار کہلاتا ہے اس کے احاطۂ اختیار میں ہر وہ چیز ہے جس کو نظر دیکھ سکتی ہے اور جو تصوّر میں آ سکتی ہے۔ سڑکوں، نالیوں، نہروں، کنوؤں، دریاؤں،

پاگل خانوں، مرغی خانوں، کارخانوں، قید خانوں، مردان خانوں، زنان خانوں۔ غرض جملہ قسم کے خانوں، دفتروں، تھانوں، مدرسوں، گاڑیوں، چھکڑوں، موٹروں، جہازوں، گھوڑوں، گدھوں، باغوں، جنگلوں، زمینوں، آسمانوں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کے معائنہ کرنے کا ممبر کو حق حاصل ہے رعیت کا نمایندہ ہونے کی وجہ سے ممبر کو حق ہے کہ تمام باتوں کو معلوم کرے اور ہر چیز کا اندازہ لگائے اور اس کے بعد یہ بھی حق ہے کہ اندازہ زیادہ لگائے یا کم لگائے یا نہ لگائے۔ فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست۔ ممبر کو قلم مارنے اور زبان ہلانے کا بھی حق ہے۔ اس میں وہ رتی برابر بھی تکلف نہیں کرتا۔ انفرادی اور اجتماعی ترقی ممبر کا نصب العین ہے اور اس کو اختیار ہے کہ گھر کو جنت بنا کر ترقی کا اظہار کرے یا قید خانہ کو گھر بنا کر بہبودی کی صورت نکالے۔ لیجسلیچر کے اندر والے حقوق ممبر کو عام انسانوں سے اونچا بنا دیتے ہیں اور یہ مخصوص حقوق محض زبان کا کرشمہ ہیں۔ لمبی زبان والے کا کوئی منہ بند نہیں کر سکتا اور "کل جگے" سے سب پناہ مانگتے ہیں۔ انسانی خیال ہر قسم کی بندش سے آزاد ہے۔

زبان خیال کی ترجمانی کرتی ہے۔ اُسے بھی آزاد ہونا چاہیئے ورنہ صحیح ترجمانی نہیں کر سکتی۔ مگر عام طور پر زبان کی آزادی خیال کی آزادی کے مقابلے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی اسی واسطے بزرگوں نے نصیحت فرمائی ہے کہ دو سُن کر ایک کہنا چاہیئے اور وہ ایک، باون تولہ پاؤ رتی کی ہو۔ مگر ممبر کی حیثیت جدا ہے۔ لیجسلیچر کی چہار دیواری میں ممبر کو زبان کی آزادی کا بلا روک ٹوک کے پورا حق حاصل ہے۔ وہاں ممبر کو ہر بات اُجاگر کر کے دکھانا پڑتی ہے۔ حقیقت کو عُریاں کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ قانون ساز چہار دیواری میں ممبر کے لئے جائز ہے کہ اپنے قلبی و دماغی بخارات کو جس طرح چاہے نکالے۔ تعزیرات ہند اور ڈی، آئی، آر وغیرہ کا وہاں گذر نہیں ہو سکتا۔ کنٹرول یہاں پر گُناہ ہے اس لئے کہ کنٹرول سے اچھے نتیجے نہیں پیدا ہوتے۔ مجلس قانون ساز میں گورنمنٹ کے علاوہ دیگر پارٹیاں بھی ہوا کرتی ہیں جن کی آواز شاید زور دار نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا آزادیٔ تقریر اس لئے بھی ضروری ہے کہ کمزور آواز والے دل کھول کر اپنی بھڑاس نکال سکیں۔ اکثر یہ مہین اور باریک آوازیں مائیکروفون کی خرابی کی وجہ سے

گورنمنٹ کے کان تک نہیں پہونچا کرتیں - ایسی حالت میں بعض اوقات مخالف پارٹی کے لوگ اجلاس سے رخصت ہو جاتے ہیں جس کو "واک آؤٹ" کہا جاتا ہے -

ممبر کا فرض ہے کہ پبلک مفاد کی خاطر گورنمنٹ کو متوجہ کرے لیکن مفاد کی کوئی تعریف مقرر نہیں ہے - فرضی بھی ہو سکتا ہے خیالی بھی ہو سکتا ہے اور واقعی بھی - ممبر کو حق ہے کہ پبلک مفاد کی ہر دفتری کارروائی گورنمنٹ سے معلوم کرے لیکن ممبر کو حق نہیں ہے کہ گورنمنٹ کے رازہائے سربستہ یا گورنر اور گورنر جنرل کے اختیارات کے متعلق زبان کھول سکے - یہ سُن کر شاید کوئی کہہ بیٹھے کہ "خدائی فوجدار" کو کٹھیا کٹھلوں کو ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہو سکتا - اس کی وجہ یہ ہے اور قرین عقل بھی ہے کہ محتسب را درونِ خانہ چہ کار - اس کے علاوہ قانون میں استثنےٰ ضرور ہونا چاہیئے اگر اس قسم کی ممانعت نہیں ہوتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خدائی فوجدار خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھتا - ممبر کو آدمی ثابت کرنے کے لئے یہ استثنیٰ ضروری سمجھا گیا - اب رہا گورنمنٹ کو متوجہ کرنا تو اس کے ہزاروں گُر ہیں

رزولیوشن پیش کر دیا۔ بل بنا ڈالا۔ سوال کر لیا اور طرح طرح کی پھلجھڑیاں اور ہوائیاں چھوڑ دیں۔ کہتے ہیں سوال سے آدمی کی آبرو جاتی رہتی ہے۔ مگر جب ممبر سوال کرتا ہے اور بال کی کھال نکالتا ہے تو اس کی عزت آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ رزولیوشن اور بلوں کے مباحثوں میں آزادی تقریر کے سیکڑوں تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ ممبر کو حق ہے کہ صاحب صدر کی اجازت لے کر کسی اتفاقیہ ضرورت پر بحث کرنے کے لئے اجلاس کی مقررہ کارروائی کو ملتوی کرا دے۔ ممبر کو حق ہے کہ جب بولے تو کھڑے ہو کر بولے۔ ممبر کو حق ہے ہر مسئلے پر اپنا ووٹ دے۔ یہ ووٹ بسا اوقات پارٹی کی آن رکھنے کے لئے بھی دیئے جاتے ہیں اور یہ ایثار اور یگانگت کی بہترین مثال ہے۔ یہ آزادی کی جوش بھری تقریریں جو اجلاس کے اندر کی جاتی ہیں اور جن پر تعزیرات ہند کی نظر نہیں لگتی بیرونی دنیا کے سامنے تحریر کی صورت میں پریس اور اخبار بزعم خود پیش کر دیا کرتے ہیں مگر اُن کی اشاعت پر اگر چاہے تو عدالت مزاج پرسی کر سکتی ہے۔ اگر کوئی گلا پھاڑ پھاڑ کر کوچہ و بازار میں ان کو دُہراتا پھرے تو وہ بھی

قانونی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ اگر ممبر خود پبلک میں لیجسلیچر والی آزادیٔ تقریر سے کام لے تو اس کے مقدر میں یا قید خانہ ہوتا ہے یا جرمانہ یا خطاب دیوانہ

جوشِ تقریر میں اجلاس کے اندر اگر ممبر دیوانگی و بے قاعدگی کا اظہار کرے اور جنابِ صدر کی تنبیہ اور مخالفت کو محض ہوائی سمجھ کر معافی نہ مانگے تو ایسے ممبر کو "اجلاس بدر" کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ممبر کی کوئی ذلت نہیں ہوتی۔ یہ محض تمیز اور آداب سکھانے کی ایک انتظامی تدبیر ہے کسی جرم کی وجہ سے کسی ممبر کو کوئی قانون لیجسلیچر کی چار دیواری میں گرفتار نہیں کر سکتا۔ اجلاس سے چودہ دن پہلے اور چودہ دن بعد بھی گرفتاری ممکن نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ممبر کو جس طرح چودہ دن پہلے تیاری کرنے کا حق ہے اسی طرح اجلاس سے چودہ دن بعد اپنی تکان دُور کرنے کا بھی حق ہے، جو ممبر بدقسمتی سے قید خانہ کی سکونت پر اس سے پہلے راضی ہو چکا ہو اس کو اس کی رائے کے لئے اجلاس اور کمیٹیوں میں آزاد کرا کر بُلایا جا سکتا ہے۔

اب حقوق کی تیسری قسم وہ ہے جو لیجسلیچر کے اندر اور باہر ہر جگہ پر یکساں رہتی ہے۔ ممبر کو حق ہے کہ اجلاس کے اندر بھی ممبر رہے باہر بھی ممبر رہے اور چوبیس گھنٹے ممبر رہے۔ وہ اندر باہر سوتے جاگتے ہر وقت اور ہر حالت میں اپنے نام کے ساتھ تین حرف لگانے کا حق رکھتا ہے۔ خواہ وہ ایم، ایل، اے (M.L.A) ہو خواہ وہ ایم، ایل، سی (M.L.C) ہو۔ اگر کسی عالم میں وہ ان تین حرفوں سے موسوم نہ کیا جائے تو یہ اس کی توہین ہے اور توہین کرنے والوں پر صاف مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

ممبر اپنے حقوق کی ادائیگی میں اپنے بیوی بچوں اور خانگی معاملات کو بھول جانے کا حق رکھتا ہے اس بھول کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے گورنمنٹ سفر خرچ۔ یومیہ اور ماہانہ کی صورت میں ہر ممبر کو نذرانہ دیا کرتی ہے۔ گورنمنٹ جانتی ہے کہ بھوکا کاٹنے کو دوڑا کرتا ہے۔ اور وہ بھوکا اگر ممبر ہو تو خدا کی پناہ۔ جرمانہ اور قرضہ کی ڈگری میں بشرطیکہ ممبر پر ہوں۔ ممبر کی ذات۔ ملکیت اور اولاد سب کچھ قرق ہو سکتی ہے مگر نہیں قرق ہو سکتا تو یہ نذرانہ۔ گورنمنٹ نے

اپنی حفاظت خوداختیاری کے ماتحت خوب سوچ سمجھ کر ممبر کو یہ حق دیا ہے کہ یہ نذرانہ فرق نہ ہو

ممبر اپنے ان تینوں قسم کے حقوق کو کبھی نظرانداز نہیں کیا کرتا۔ یہ بات اور ہے کہ کبھی کسی حق کے برتنے کا اس کو خیال نہ رہے یا کسی حق کا اس کو سرے سے علم ہی نہ ہو۔ ممبر گورنمنٹ کی مشین کا چلتا ہوا پُرزہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایک پُرزہ بگڑ جانے سے پوری مشین بند ہو جایا کرتی ہے وہ اس حقیقت کو خوب سمجھتا ہے اور اپنی اہمیت کے اظہار میں کبھی نہیں چوکتا۔ ممبر ترقی کرکے چشم بد دُور اگر ہوم ممبر بن جائے تو اس کی رفیع الدرجائی کو حق ہے کہ گالیوں کو دعائیں سمجھے۔ انتقام نہ لے اور خدمات میں ذوق وشوق کے ساتھ سرگرم رہے۔

شاید کسی صاحب کو یہ جملہ حقوق یاد نہ رہیں اس لئے دریا کو کوزہ میں بند کرکے پھر گنائے جاتے ہیں۔

نمبر ا:۔ مجلس قانون ساز کی کارروائی اور اجلاس کا اگر کوئی منصب کسی ممبر کو حاصل ہے تو ان فرائض کی ادائیگی میں کوئی عدالت مداخلت نہیں کرسکتی

نمبر ۲:۔ اجلاس کے اندر ممبر کو مکمل آزادی حاصل ہے اور وہ اپنی زبان اور رائے کا مختار ہے جس طرح چاہے استعمال کرے دنیا کی کوئی عدالت اس سے باز پرس نہیں کر سکتی۔

نمبر ۳:۔ ممبر اجلاس کے اندر اور اجلاس کی شرکت سے چودہ دن پہلے اور چودہ دن بعد گرفتار نہیں کیا جا سکتا اگرچہ اس نے عدالت کا کیسا ہی جُرم کیوں نہ کیا ہو۔

نمبر ۴:۔ ممبر کو فارغ البال کرنے کے لئے گورنمنٹ سے نذرانہ ملا کرتا ہے اور وہ نذرانہ قرق ہونے سے محفوظ ہے۔

ان مخصوص حقوق کو دوبارہ اس لئے ذہن نشین کرا دیا کہ "داشتہ آید بکار" اور وقت ضرورت کام آئیں

بندر کا ناچ

کانگریس اور مسلم لیگ کے اصل مقاصد کس کو نہیں معلوم۔ دونوں اپنے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے چوٹی ایڑی کا زور لگائے ہوئے تھیں۔ لیگ کو ضد تھی کہ کچھ ہو مگر "لے کے رہیں گے پاکستان" کانگریس کو ناز تھا کہ "تقسیم نہ ہونے دیں گے ہندوستان" ہر جماعت کی نظر میں اسی کا اصول انگریز کی بلا سے نجات دلوا کر آزادی کی جنت میں پہونچانے کے لئے کافی اور یقینی تھا اور اتنا یقینی تھا کہ کسی بھاؤ پہ رقابت دور نہیں ہو سکتی تھی اور کسی تدبیر سے ایک اصول پر اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نہیں ہوا۔

وائسرائے بہادر کے اعلان پہ بلا چون وچرا سب نے سر جھکا دیا۔ موقع کی نزاکت کا عمر بھر میں سب سے پہلی مرتبہ ہر جماعت کو احساس ہوا کہنے والے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ سننے میں آیا ہے کہ وائسرائے بہادر نے

ہر لیڈر کے، پہلے ہی از قسم دھمکی یا لالچ دے کر کوئی چینز گلے اُتار دی تھی بہرحال انگریز کو یہاں سے نکالنا سب کا مطلب تھا۔ اس لئے انگریز کی بات ہنسی خوشی مان لی گئی اور ویسی ہی مان لی گئی جیسی کہ انگریز چاہتا تھا اور اس لئے بھی مان لی گئی کہ انگریز نے اپنی کمزوری کا نہایت سچائی سے اقبال کر لیا کہ اب ہم سے حکومت نہیں ہوتی اور ان جماعتوں نے یقین کر لیا کہ ہماری قوت کے سامنے سر جھکا دیا اور آزادی مفت میں مل گئی۔ کانگریس اور لیگ جس قدر بھی فخر کریں کم ہے اور واقعہ ہے کہ فخر کرتے کرتے مُنہ سوکھے جا رہے ہیں اور جامہ سے باہر ہیں۔

" انگریز نکل گیا اور آزادی مل گئی" ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے اور آسمان سے اُدھر کسی کا دماغ نہیں دکھائی دیتا۔ مگر دل اندر ہی اندر صاف صاف کہہ رہا ہے۔

"تماشا دکھا کر مداری گیا"

سچے احساس کو خبط کرنے کے لئے زبانیں کہہ رہی ہیں۔ ہندوستان جوڑنے کے لئے تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اور "پاکستان ناقص ہی سہی مگر آن تو رہی"۔

انگلستان کے وزیر اعظم نے اعلان کر دیا کہ "جون ۱۹۴۸ء میں ہم دستبردار ہو جائیں گے۔ آزادی لے کر اپنا انتظام خود کرلو" لیڈروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انتظام کے منصوبے گانٹھے جانے لگے۔ اپنی اپنی ڈھپلی اور اپنا اپنا راگ حسب معمول الاپا جانے لگا۔ اور ہر جماعت جنت کے خواب دیکھنے میں سرشار ہو گئی۔ چند سر پھروں نے شک کیا کہ اتنی جلد چارج دیا اور لیا کیسے جا سکتا ہے۔ نوجوان بخت وائسرائے بہادر نے بتا دیا کہ یوں۔ جون ۱۹۴۸ء کیسی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی آپ کی جوتیوں پر قربان ہو کر رہے گی۔ ہوشیار اور صاحبِ عقل ہندوستانیوں کو چارج لینے کی تدبیر بھی بتا دی۔ ہندوستان کی تقسیم ہو رہی ہے اور ہر شخص خوش ہے اور کسی کو مایوسی نہیں۔ مُنھ مانگی مُراد پائی۔

کانگریس POSTTIVE شکل میں علانیہ فرقہ واریت کی دشمن تھی۔ مسلم لیگ NEG ATIVE صورت میں در پردہ اس کے خلاف تھی۔ دونوں آپس میں من سمجھوتے کے لئے ہر وقت آزاد تھے۔ مگر من سمجھوتے میں ہر ایک کو اپنی ذلت دکھائی دیتی تھی۔ اب ماری کی لکڑی کے

زور پر فرقہ وارانہ تقسیم ہو رہی ہے اور سب کو پاک نیتی کے ساتھ قبول ہے۔ اگر کوئی جدوجہد ہے تو تقسیم در تقسیم کے متعلق ہے اور بس

کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

زمانہ کو ساکن نہیں کہا جا سکتا وہ برابر حرکت میں ہے۔ ہر دور اپنا فسانہ رکھتا ہے پہلے آزادی کے لئے اتحاد اور یگانگت کی ضرورت ہوتی تھی اب نئے دور میں جب سے ایٹم بم کا زمانہ آیا ہے۔ آزادی بغیر افتراق اور تقسیم کے ممکن نہیں

جب زمانہ بدل گیا تو لیڈر کیوں نہ بدلیں اور کیوں تقسیم کا ترانہ نہ گائیں جب یہ معیار ہے تو وجہ کیا کہ فرقہ وارانہ تقسیم میں بھی خود غرضانہ عمل اپنا کام نہ کرے مسلم لیگ کے اگر فرقہ واریت کا سہرا بندھا ہوا تھا تو کیا وجہ کہ آج ٹنڈن جی اپنی قوم کو اسی معیار پہ نہ للکاریں۔ خدارا انصاف مسلم لیگ اور کانگریس ان پر اعتراض کیوں کریں۔ اصول کا تقاضا ہے کہ بجائے اعتراض کرنے کے خم ٹھونک کر اسی پر عمل کریں اور اپنے جوہر دکھائیں

زمانہ بدل گیا ہے۔ انقلاب زندہ باد۔ فنا کے ذریعہ اگر بقا کی

کوشش کی جائے تو عین مصلحت ہے۔ و یانت اور ویدانت سے متاثر تصوف اس مصلحت کی تائید میں ہے

فنا میں بقا کی صورت نظر آ رہی ہے۔ اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں فتنہ و فساد کی ہوا پھیل رہی ہے۔ بلوے ہو رہے ہیں آگ لگائی جا رہی ہے۔ جانیں لی جا رہی ہیں۔ گاؤں تباہ کئے جا رہے ہیں۔ امن کو مٹایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ آزادی کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں اور آزادی بغیر خونریزی کے نہیں مل سکتی

ان فتنوں کو اہل ہنود اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ اقلیت کو ختم کر کے اپنے دونوں میٹھے کر لیں۔ ان فتنوں کی وجہ مسلم لیگ یہ سمجھتی ہے کہ ان لوگوں کو پاکستانی حکومت سے ڈر ہے اور اس طرح مشق کر کے آئندہ پاکستانی حکومت پر حملہ کرنے کی تیاری کی جاتی ہے۔

گاندھی جی اور پنتھ جی دانت میں انگلی دبائے ہوئے ہیں کہ آزاد ملکوں کی نظر میں ہندوستانی آزادی قابل شرم ہو گی یا لائق فخر؟

زمانہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ آفریں ہے جان بُل پر
کہ اس کا اصول کبھی اور کسی طرح نہ بدلا۔ وہ ہر موقع پر بے لاگ
DIVIDE کر کے دولھا بن جاتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آزادی
دے کر انگریز نے ہندوستان سے اپنا بوریہ باندھا یا ہندوستان
میں اور زور سے اپنے پیر جمائے؟

پر کتر کے مرے صیاد نے چھوڑا ہے مجھے
نام اس قید کا رکھا ہے رہا ہو جانا

طلوعِ آزادی

(مطبوعہ آزادی نمبر اطلاعات لکھنؤ اگست ۴۷ء)

انقلاب انقلاب تو سب کہتے ہیں اور انقلاب کا نام ہمیشہ سُنتے آئے ہیں مگر آج ۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کل تک ہم مجبور اور محبوس تھے اور آج آزاد اور مختار ہیں۔ کل تک ہم اپنے جملہ ادبار کے لئے تیسری شخصیت کو ذمہ دار قرار دیا کرتے تھے۔ آج وہ تیسری شخصیت برضا و رغبت معدوم ہو رہی ہے۔ اور ہم دو کے چکر میں ہوں تو ہوں مگر اپنے مالک اپنے آپ ہیں۔ تثلیث سے نجات پا کر ثنویت کے شرک کو ہم بُرا سمجھیں تو یہ عین جذبۂ توحید ہے اور توحید کا یقیناً بول بالا ہو کر رہے گا۔

کنجِ قفس سے نکل کر آزادی کی ہوا اسی وقت راس آتی ہے جب کہ پروں میں قوتِ پرواز ہو۔ کانگریس نے جد و جہد کر کے اور

ایثار و قربانی سکھا کر قوتِ پرواز کو ترقی دینے میں برابر کوشش کی ہے۔ جذبۂ توحید ہم میں موجود ہے۔ کانگریس نے ایثار اور قربانی کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے لہذا انقلاب سے مرعوب ہوئے بغیر انقلاب پر حاوی آ کر ہم اپنے آپ کو آزاد ثابت کر سکتے ہیں اور کر دیں گے۔

"تا بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی" کا یہ ایک پرانا مقولہ ہے مگر بہترین آزاد ملک وہ ہے جہاں "آزارے نباشد۔ جہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہوں اور جہاں حاکم و محکوم، غریب و امیر بلا امتیاز پہلو بہ پہلو چلتے ہوں۔

یہ انقلاب صاف کہہ رہا ہے نہ کسی کی ہمیشہ بنی ہے اور نہ آیندہ بنی رہے گی۔ کل کیا تھا آج کیا ہو گیا اور خدا جانے کل کیا کیا ہوگا۔ اگر اس حقیقت پر نظر رکھی گئی تو کامیابی ہمارا مقدر ہے۔ چرچل نے جنگ جیت کر بڑا نام اُچھالا۔ اور واقعی بڑا کام کیا مگر آج چرچل کا نام کہیں نہیں سُنائی دیتا۔ آج سہرا مسٹر ایٹلی کے سر ہے۔ مسٹر میکڈانلڈ اس سہرے کی آرزو میں لغو بھی ثابت ہوئے

اور مربی بھی گئے۔ دیوآں کی ہندوستان سے محبت تسلیم۔ مگر ہندوستان کا محبوب خادم ماؤنٹ بیٹن کو بننا تھا۔ کانگریس نے یہ آزادی کی بازی بے لاگ جیت لی لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ چل کر کون سی پارٹی برسرکار رہے گی اور حکومت کی باگ کس کے ہاتھ میں ہو گی سب کچھ سہی مگر انقلاب برابر ظاہر کر رہا ہے کہ اس تقسیم اور اس تغیر کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ دونوں اپنے اپنے نظریوں اور پالیسیوں کو بدلنے کے لئے مجبور ہیں۔ کل کے نظریے کل کے ساتھ تھے آج کے لئے نئے اصول ہوں گے۔ جو گذشتہ کو خیرباد کہہ کر آیندہ کے لئے پہلے آمادہ ہوگا وہی "میر" کہلائے گا۔ جب ایسا مقصد عالی ہو۔ اور ایسا ربط ضبط ہو تو آزادی ایک رحمت ہے اور آج رحمت کو خوش آمدید کرنے کو ہر شخص تیار ہے۔ مبارک سلامت مبارک سلامت۔

بدایوں میں آزادی کے دن

حضرات!

ایک ادنیٰ ترین خادم ہونے کی وجہ سے بحمداللہ آج مجھے یہ فخر و سعادت حاصل ہے کہ میں اعلان کردوں کہ بفضلہ آج ہم سب آزاد و خود مختار ہیں۔ کل شام تک ہم غلام تھے۔ آج آزاد و خود مختار ہو گئے۔ رات بھر میں نیا سماں اور نیا نظارہ پیدا ہو گیا۔ اسے انقلاب کہتے ہیں۔ اس تبدیلی اور آزادی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ آج سے نیچے والے طبقے میں احساس کمتری دُور ہو جائے۔ اور اونچا طبقہ احساس برتری کو کم کردے۔ احساس کمتری بداعتمادی سے پیدا ہوتا ہے۔ آزادی میں بداعتمادی پیدا نہیں ہوا کرتی۔ لہذا خوب سمجھ لیجئے کہ ہم سب ایک ہیں اور آزاد ہیں۔

پولیس پیشہ شریف ہے ملک و وطن کی جان و مال کی حفاظت کا یہ ذمہ دار ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس محکمہ کا ہر شخص اپنے جی میں



۱۵ اگست کو پولیس گراؤنڈ بدایوں میں پولیس کی سلامی لینے کے بعد
آنریبل پریمیئر کا پیغام آزادی وحید احمد صاحب سُنا رہے ہیں

Honourable
Prime Minister

خوب سمجھ لے کہ آج سے وہ کسی غیر کی خدمت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی ہی خدمت کر رہا ہے۔ اور خدمت سے یقیناً عظمت ہوا کرتی ہے۔ آج مجھے پولیس سلامی دے رہا ہے اور آج میں پولیس کی سلامی لے رہا ہوں یہ کوئی کھیل تماشا اور تفریح نہیں ہے۔ اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ کچھ پولیس ذمہ داری محسوس کر رہا ہے اور کچھ میں ذمہ داری محسوس کر رہا ہوں اس سلامی کے یہ معنی ہیں کہ میرا کٹا ہوا ہاتھ میرے جسم کی طرف بڑھا ہوا چلا آ رہا ہے اور میرا ناقص کندھا برابر اس کٹے ہوئے ہاتھ کی طرف جھکا ہوا چلا آ رہا ہے۔ یہ کٹا ہوا ہاتھ ناقص کندھے سے مل کر اور پیوست ہو کر جسم کے نقص کو دور کر دے گا اور میرے جسم میں جو طاقت ہوگی اس کا تماشا میں دنیا کو دکھا دوں گا

حضرات !

اب میں آنریبل پنڈت گوبند بلبھ پنتھ صاحب وزیر اعظم حکومت یو، پی کا پیام پڑھ کر سناتا ہوں ۔ اسے سنئے۔ سمجھئے اور گھروں گھروں پھیلا دیجئے ۔

اکبر کے لطیفے

(آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے ۲۹، اگست کو براڈ کاسٹ کیا)

خدا، مغفرت نصیب کرے سید اکبر حسین صاحب جج الہ آبادی اپنے رنگ میں یگانۂ روزگار تھے ۔ کون سا ایسا مسئلہ ہے جس پر انھوں نے طبع آزمائی نہیں کی ۔ ان کا کلام ان کے عہد کی سچی تصویر ہے ۔ جس میں انھوں نے ظرافت سے رنگ بھر دیئے ہیں انھوں نے مغربی تمدن کا مضحکہ اُڑایا ۔ مشرقی شعار کی تلقین کی ۔ حاکم و محکوم پر روشنی ڈالی ۔ تنگ خیال مولویوں کی قلعی کھولی ۔ اخلاق و تعلیم کا سبق پڑھایا ۔ اُردو ہندی کا موازنہ کیا ۔ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا کانگریس کو سراہا ۔ قافیوں کا قافیہ تنگ کر دیا ۔ مضمون آفرینی میں کمال تھا ۔ تشبیہیں اچھوتی ہوتی تھیں اور یہ سب کچھ منھ بنا کر اور پیشانی پر بل ڈال کر نہیں کہا ۔ بلکہ اس طرح کہا کہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جائے اور دل میں بات اُتر جائے ۔ اکبر کے طنز ایسے نہیں کہ

محسوس نہ کئے جائیں ایسی بیگمانی چٹکیاں لیتے تھے کہ درد بھی ہو اور لطف بھی آئے۔

کلام اور شاعری برطرف گفتگو بھی شوخی سے بھری ہوتی تھی اکثر احباب ان کی محفل میں بات کرتے ڈرتے تھے کہ خدا جانے کون سی بات کس وقت پکڑ لیں اور پھبتیاں کس دیں۔ بات آجاتی تو چھوٹا ہو یا بڑا معاف کرنے والے نہ تھے۔

۱۔ پروفیسر نامی صاحب سے بے تکلفی تھی انھوں نے پوچھا "سید صاحب! آپ اپنی پہلی بیوی سے کیوں کشیدہ ہیں آخر پہلے تو میل جول تھا۔" جواب دیا "بے دلی سے ملنے جلنے کا کیا ہے۔ یوں تو روزانہ چند منٹ کو پاخانہ کے واسطے بھی قدمچوں پر ناک بند کر کے بیٹھا کرتا ہوں۔"

۲۔ قمرالدین صاحب بی، اے بدایونی مصنف "بزم اکبر" رقم طراز ہیں کہ ایک مرتبہ سائیکل سے گرنے پر چوٹ آجانے کی وجہ سے کئی دن تک "عشرت منزل" نہ جا سکا۔ خط آیا کئی دن سے آپ نہیں ملے۔ خدا کرے سائیکل بخیریت ہو۔ اُسی کی تقویت پر

شکایت ہے۔ اس کے بعد جب میں اُن کی خدمت میں گیا تو عرض کیا کہ "آپ کو الہام ہوا تھا کہ سائیکل کی خیریت دریافت کی۔ واقعہ یہ تھا کہ نہ سائیکل ٹھیک تھی اور نہ میں آنے کے قابل تھا۔" فرمایا "افسوس ہوا۔ مجھے تو عہدِ حاضر کی اچھی سے اچھی ایجاد میں بھی مضرّت کے پہلو نظر آتے ہیں۔ خواہ وہ موٹر ہو یا ہوائی جہاز یا بائیسکل۔" ٹھہر کر فرمایا! "اور پھر بائیسکل تو مجسم روگ ہے۔ تین لفظوں سے مرکب ہے۔ اور تینوں سے بیماری عیاں ہے۔ بائی بذاتِ خود مرض ہے۔ سِک اور اِل دونوں کے معنی بیمار کے ہیں۔

Ill. Sick

بائی سیک ال (بائیسکل)

۳۔ ان کے صاحب زادے سیّد عشرت حسین صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۴ء میں بمقام سیتاپور میں ڈپٹی کلکٹر تھا۔ میرے والد مجھے اور بچّوں کو دیکھنے آئے تھے۔ جب واپس جانے لگے تو ٹرین کے آنے میں دیر تھی۔ پلیٹ فارم پہ آرام کرسی پر انھیں بٹھا دیا گیا۔ دس پندرہ احباب رخصت کرنے کے لئے آئے تھے۔ وہاں تحصیلدار صاحب بھی تھے۔ انھوں نے کسی سے دریافت کیا

کہ یہ کون صاحب ہیں۔ جواب میں بتایا گیا کہ خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج اور شاعر ہیں ۔ یہ سُن کر تحصیلدار صاحب دوسری طرف متوجہ ہو گئے ۔ بعد کو تحصیلدار صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ میرے والد ہیں۔ تو قریب گئے ۔ تعظیم دی۔ دریافت کیا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ چپراسی کو پنکھا جھلنے کا حکم دیا۔ ٹھنڈا پانی پینے کو منگوایا اور خاطر و مدارات کرنے لگے ۔ میرے والد نے ابتدائی بے رخی محسوس کر لی تھی ۔ حاضرین سے فرمایا کہ یہ تو اچھا خاصا لطیفہ ہو گیا ۔ اللہ میاں پورب میں پہونچے ۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ بڑے میاں کون ہیں ۔ تو بتایا گیا کہ یہی تو اللہ میاں ہیں۔ ان ہی نے تو سارا عالم بنایا ہے اور ان ہی کا یہ سب ظہور ہے مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہیں کی ۔ اتنے میں ایک صاحب نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے والد ماجد آپ ہی ہیں ۔ پھر کیا تھا سب کے سب عقیدت سے جُھک گئے ۔

۴۔ سید اکبر حسین صاحب کو کچھ جگر کی شکایت ہوئی ۔ ایک صاحب نے اونٹنی کا دودھ تجویز کیا لہذا اونٹنی کی تلاش تھی ۔ اس

سلسلہ میں فرمایا "جگر کی خرابی پھر شیر خوار بنا رہی ہے۔ ماں باپ نے غلطی کی۔ بچپن میں کسی دراز قامت انّا کا دودھ پلوا دیتے تو آج اونٹنی کی تلاش کیوں ہوتی"

۵ - ایک مرتبہ طبیعت ناساز تھی۔ ایک ڈاکٹر بلوائے گئے انھوں نے آلہ لگا کر جسم کا معائنہ کیا۔ اور بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں۔ صرف دل ذرا تیزی سے بیٹ (Beat) کر رہا ہے اکبر صاحب نے فوراً فرمایا "اگر آپ یہ کہتے کہ مرغ دل تیزی سے بیٹ کر رہا ہے تو یہ بات فوراً سمجھ میں آجاتی

۶ - اکبر حسین صاحب لکھنؤ آئے اور حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ سے ملنے گئے۔ وہ اندر تھے۔ شور مچ گیا کہ باری میاں کو خبر کر دو۔ جج صاحب ملنے آئے ہیں۔ مولانا صاحب برآمد ہوئے تو سید صاحب نے کہا "کہ اچھا ہوا کہ آپ کے والد نے آپ کا نام عبداللہ نہیں رکھا ورنہ یہ سب آپ کو اللہ میاں کہہ کر پکارتے!"

۷ - قمر صاحب لکھتے ہیں کہ ایک روز مجھ سے دریافت کیا کہ بیوی کو راضی رکھنے کا نسخہ آپ کو معلوم ہے۔ میں نے کہا آپ فرمائیں

ارشاد ہوا "اگر بیوی نئی روشنی کی ہو۔ تو اس کے چال چلن پر اعتراض نہ کرو اور اگر پُرانے خیال کی ہو تو اپنا چال چلن درست رکھو، زندگی اچھی کٹے گی"

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا۔ انھیں غصہ نہیں آتا

۸۔ ایک جنٹلمین ایک روز ملنے کو آئے۔ گفتگو عورتوں کی تعلیم اور آزادی پر چلی۔ سیّد صاحب نے فرمایا "ہم آزاد خیالی کا امام سیّد احمد خاں کو سمجھتے تھے۔ لیکن عورتوں کی آزادی اُن کو بھی پسند نہ تھی۔ ان صاحب نے کہا تو سرسیّد کی رائے قابلِ ترمیم ہے"۔ فرمایا اس معاملہ میں ہی نہیں بلکہ اور باتوں میں بھی قابلِ ترمیم ہے۔ اور صرف رائے ہی نہیں بلکہ سرسیّد خود قابلِ ترمیم ہیں۔ چنانچہ زمانے نے ان کی بھی ترمیم کر دی۔ اور ان کے بجائے آپ کو پیدا کر دیا۔

۹۔ بزمِ اکبر میں پروفیسر کیپٹن ضامن علی صاحب موجود تھے۔ گفتگو یہ تھی کہ زبانِ لکھنؤ کو معیاری زبان سمجھا جائے۔ اکبر اس خیال کے خلاف تھے۔ بحث بڑھی تو سوال کیا کہ شاعری کی تعریف بتاؤ۔

سب نے کہا کہ خیالات و جذبات کو بجائے نثر کے نظم میں ظاہر کرنے کا نام شاعری ہے۔ فرمایا یہ ٹھیک ہے اب یہ مطلب ہوا کہ شاعر کے دل میں کسی اثر کے ماتحت اگر چوٹ لگے اور قدرتاً غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے اُوہ نکل جائے تو آپ اعتراض کریں گے کہ واہ صاحب۔ آہ کہنا چاہیئے تھا۔ ایسی حالت میں شاعر کو لکھنؤ تار دینا چاہیئے۔ یہ دریافت کرنے کے لیئے کہ اُوہ کروں یا آہ کروں اور جواب کا منتظر رہنا چاہیئے۔" یہ سُن کر سب قائل ہو گئے

۱۰۔ اکبر شام کو باغ میں چبوترے پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک شام کو ایک بیرسٹر صاحب جو تازہ ولایت سے تھے مع اپنی ولایتی میم صاحبہ کے آئے۔ اور کہا کہ میری میم صاحبہ کو ولایت سے ہی آپ سے ملنے کا شوق تھا ہم دونوں کی خواہش ہے کہ آپ کوئی ایسا شعر عنایت کریں جو میم صاحبہ بھی سمجھ سکیں۔ اکبر صاحب نے فرمایا۔ فرمائشی شعر بہت کم کہتا ہوں۔ تاہم ایک بات ذہن میں آگئی اُسے سُنئے ؎

وائف انگلش ہسبنڈ نیٹو
WIFE ENGLISH HUSBAND NATIVE

نائف از شی نوز از ہی
KNIFE IS SHE NOSE IS HE

" وائف انگلش ہسبنڈ نیٹو
نائف اِز شی نوز از ہی!

گویا اُس زمانے میں کوئی ہندوستانی ولایت میں شادی کر لیتا تو سمجھا جاتا خاندان کی ناک کٹوادی۔

۱۱۔ قمر صاحب راوی ہیں۔ مولوی رضا حسین صاحب میر منشی سے ملاقات کرنے گاڑی میں جا رہے تھے ان دنوں میں کلیاتِ اکبر حصّہ سوئم کی ترتیب و نقل کا کام کر رہا تھا۔ میں نے راستہ میں کہا کہ "آج الف کی تقطیع ختم کردی۔ فرمایا۔ چلو اچھا ہوا ایک علّت سے تو پیچھا چھوٹا۔ (یعنی الف منجملہ حروفِ علت ہے)

۱۲۔ مدراس سے کچھ لوگ بغرضِ سیر الٰہ آباد آئے تھے۔ ان میں پروفیسر بھوسلے بھی تھے۔ چلتے وقت ان کو یاد آیا کہ الٰہ آباد آکر اگر اکبر سے نہ ملے تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اسٹیشن سے وہ تنہا آئے اور عرض کی کہ کچھ اشعار عنایت ہوں کہ آپ کا تحفہ اپنے احباب کو پیش کرسکوں۔ اکبر نے ایک پرچہ لکھا۔ لفافہ میں بند کیا۔ اور کہا کہ "اسٹیشن پر سب کے سامنے کھولنا اور سُنانا۔ وہ خوش خوش واپس آئے سب کے سامنے لفافہ کھولا۔ اس میں لکھا تھا ؎

خوب ہے شکل میرے بھوسلے کی   رنگ کوئلے کا ہیٹ سولے کی
SOLA HAT

اگر آج سیّد اکبر حسین صاحب حیات ہوتے تو اس آزادی پر کیسے کیسے قصیدے لکھتے اور کیسے کیسے نکتے بیان فرماتے پنشن کی وجہ سے مجبور تھے۔ ورنہ اپنے متعلق وہ خود کہتے ہیں ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا!
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

فتح مُبین

(مطبوعہ اخبار نصرت یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کلکتہ)

مسئلہ وحدت الوجود یونانی۔ ایرانی اور ہندوستانی توہمات سے مل کر عجیب معجون مرکب بن گیا کہ اس کو اسلامی تخیل سے منسوب کہنے میں بھی بعض حضرت کو تکلف ہے۔ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو اسلامی توحید اور "ہمہ اوست" میں بہت بڑی حد تک مشابہت ہے۔ مسئلہ وحدت الشہود بعض طبائع کے نزدیک خالص اسلامی تصور کیا جاتا ہے۔ مگر "ہمہ از دست" میں تقسیم و تفریق کے معنی پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلامی توحید کی صحیح تائید نہیں ہوتی۔ بیرونی اثرات کو چھانٹنے کے بعد اگر وحدت الوجود کی حقیقت کو سمجھا جائے تو عین توحید کی تشریح ہو جاتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر وجود کا خاتمہ وصل پر ہوتا ہے نظر انداز کر دیا جائے تو وحدت الوجود کو اسلامی توحید کی وضاحت سمجھا جا سکتا ہے۔ جزا پنے کُل سے

ملنے کے لئے بیتاب رہتا ہے مگر مل نہیں سکتا۔ جز اپنی اس کوشش لامتناہی سے خود بقا حاصل کرتا ہے۔ اور جزو کی بقا اس کے کُل کی عظمت کا بذاتِ خود ثبوت ہے اس طرح اتحاد بھی قائم رہا اور خالق اور مخلوق کے مراتب بھی نمایاں ہو گئے۔ وحدت الشہود کے قائل افتراق کو ازادل تا آخر مانتے ہیں اور اس تعزلیث سے "کُل" کی عظمت کما حقہٗ ظاہر نہیں ہوتی۔ جن صاحبان نے ڈاکٹر اقبال کی مختصر سی نظم "محاورہ مابین خدا و انسان" کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال نے وحدت الشہود کی کمزوری کی طرف نہایت لطافت سے اشارہ کیا ہے۔ انسان سے جواب طلب ہے کہ ؎

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

مگر انسان بغیر اعتراض کو سمجھے ہوئے فخریہ جواب دیتا ہے۔ اور کس قدر بے تکا جواب نہ ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم

بہرحال یہ انسانی تازہ نوق ہستی ہے اگرچہ خود انسان کے لئے مضر ہے۔

ایٹم بم انسانی حکمت کا بہترین نمونہ ہے لیکن انسان کی سزا خود اس کی حکمت کے نمونہ میں موجود ہے اور یہی انسانی شکست کا ثبوت ہے۔ بالفاظ دیگر نسبت وجود کو منقطع کردینا انسانیت کا کمال ہے لیکن بے نسبتی کی وجہ سے اس کا خمیازہ بھی انسان ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف صحیح مقصدِ وجود کو حاصل کرنے کے لئے منشاء فطرت کو پورا کرنا بغیر وحدت الوجود کو تسلیم کئے ہوے ممکن نہیں۔

انگریز اس نکتہ کو خوب سمجھے ہوے ہے وہ اپنے ذاتی معاملات میں اتحادِ وجود کو ضروری سمجھتا ہے اور غیر ذاتی حالات میں افتراقِ وجود کو لازمی قرار دیتا ہے گویا اپنے لئے وحدت الوجود کا قائل ہے اور اغیار کے حق میں وحدت الشہود کا عامل ہے ممکن ہے کہ اسی وجہ سے ہندوستان باوجود علمی طور پر وحدت الوجود کو ماننے کے وحدت الشہود پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا ہو۔ ورنہ تقسیم ہندوستان پر

راضی ہو جانے کی کوئی ٹک سمجھ میں نہیں آتی۔ باایں ہمہ کہ ہندستان تقسیم ہو رہا ہے مگر چونکہ بالطبع ہر ہندوستانی وحدت الوجود کی طرف مائل ہے اس لئے علانیہ کہہ رہا ہے کہ ہم ملنے کے لئے جدا ہو رہے ہیں۔ تقسیم گویا اتحاد کا پیش خیمہ ہے۔ عمل اگرچہ وحدت الشہود کے مطابق ہے مگر رجحان وحدت الوجود کی جانب ہے۔ نتیجہ یقیناً عمل کے مطابق ہوا کرتا ہے لہذا تمنائے وحدت و اتحاد محض باد ہوا ثابت ہوگی جب تک کہ تعلیم وحدت الوجود کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔

اکثریت و اقلیت کی مشکل کا حل محض تعلیم وحدت الوجود ہے۔ لیکن اگر اکثریت و اقلیت میں بجائے اتحاد کے اختلاف رہا تو یہ ناؤ آج نہ ڈوبی تو کل ڈوبے گی۔ دونوں کے درمیان اتحاد کی صورت یہی ہے کہ یا تو اکثریت اپنی برتری کا دعویٰ ترک کر دے یا اقلیت روڑا نہ بنے۔ اکثریت کو اپنے مقام سے اس درجہ گرنا کہ اقلیت کے احساس کمتری کو دفع کر دے آسان کام نہیں ہے الا ماشاء اللہ نہ ہر اکثریت سے ممکن ہے لیکن برخلاف اس کے اقلیت کے لئے

یہ ممکن ہے کہ اکثریت کے مانع نہ آئے، اور اپنی ذاتی اصلاح اور ترقی میں محو ہو جائے، اس قسم کی بے نیازی اقلیت کی توہین نہیں سمجھی جا سکتی۔ اطاعت میں ذلت کا خیال کرنا یا غیرت کا تصور جمانا جنون نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن عزت کے ساتھ اطاعت کرنے کے معنی یہ ہیں کہ معاہدہ کے خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اختلاف سے بے تعلقی برتی جائے، اور بجائے مخالفت میں سر کھپانے کے اپنی ذاتی بہبودی اور ترقی پر پوری پوری توجہ اور کوشش کی جائے۔ اکثریت کی طاقت اور اقلیت کی کمزوری کسی حال میں بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ کمزور طاقتور سے مقابلہ کر کے ظاہر ہے کہ اپنا نقصان کرے گا۔ لہذا اپنی کمزوری کو تسلیم کر لینا ہی اطاعت ہے۔ اس میں عزت و ذلت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ بیماری کی تشخیص شفا کا پہلا قدم ہے لہٰذا اقلیت کو ضروری ہے کہ قوت آزمائی نہ کرے اور یکسو ہو کر اپنی صحت کی تدبیر اختیار کرے۔ اقلیت کو صحت، جسمانی قوت سے حاصل نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ اخلاقی اور روحانی قوت سے حاصل ہوا کرتی ہے اور اس قسم کی

قوتوں میں ترقی کرنا کبھی بھی قابلِ اعتراض نہیں سمجھا جا سکتا۔ عادتِ صبر۔ اصلاحِ اخلاق اور پختگیٔ ارادہ ہی وہ اوصاف ہیں جو اقلیت میں چار چاند لگا دیا کرتے ہیں اور ان سے پیدا ہونے والی عالی ہمتی ہمیشہ اکثریت کو حیران کر دیا کرتی ہے۔ حیرانی کے بعد اکثریت یا تو اس کی قدر کرتی ہے یا اپنے غم و غصہ میں خود اپنا سر پھوڑ لیا کرتی ہے۔ اس طرزِ عمل اور طریقِ کار کو ہی مقاومت مجہول (ستیا گرہ) کہا گیا ہے۔ اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ صلح حدیبیہ کے ہر پہلو کو نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے۔ جس کی وجہ سے مدینہ کے مٹھی بھر مسلمان اہلِ مکہ کی اتنی بڑی اکثریت پر بغیر کسی قتل و غارت کے خود بخود غالب آ گئے۔ صلح حدیبیہ کے شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے اس وقت کا عام مسلمان کس قدر بد دل اور ناراض تھا۔ ان شرائط میں ظاہر الطور پر ذلت محسوس کی جا رہی تھی مگر ہادیٔ برحق کی ہدایت نے اپنی تعلیم اور اپنے اخلاق سے مسلمانوں کو عالی ہمت بنا دیا تھا اور بفضلہٖ وہی نقشہ جس میں ذلت کا تصور باندھا جاتا تھا عزت کا پیش خیمہ ہوا

اور فتح مبین کے نام سے موسوم ہوا - یہ فتح مبین حقیقت میں وحدت الوجود کی بذات خود تصویر ہے۔ ذاتیات، نفسانیت اور عقل زاید کی نفی وحدت الوجود کی تعلیم میں لازمی قرار دی گئی ہے یہ نفی افلاطون کی نفی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ اس نفی کا لازمی نتیجہ اثبات خودی ہے - خودی جب ترقی کر کے استقلال کی صورت اختیار کرتی ہے تو وہی "فتح مبین" کہلائی جانے کا حق رکھتی ہے

اقلیت کے لیڈر میں اگر اتنی جرأت وہمت ہے کہ بغیر چون وچرا کے سر اطاعت خم کر دے اور معاہدہ سے خاطر خواہ استفادہ کرے اور اقلیت کو اس طرح خود اعتماد بنا دے تو وہ دن دُور نہیں کہ بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں اور منقسمہ ہندوستان متحدہ ہندوستان بن کر چار دانگ عالم میں اپنا پرچم لہرائے

عید کے موقع پر گائے کی قربانی ضروری نہیں

(مطبوعہ قومی آواز لکھنؤ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء)

قومی آواز مورخہ ۲۰ ستمبر میں دو اپیلیں درج ہیں جن کا منشاء ہے کہ عید کے موقع پر گائے ذبح نہ کی جائے۔

۱۔ قوم مسلمان سے چند لیگی لیڈروں کی مشترکہ اپیل یوں ہے:۔

"ہندوستانی یونین کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اس نازک موقع پر ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ایک واضح اور قطعی لائحہ عمل پیش کریں گے ...... یعنی ...... ہم انتہائی ذمہ داری کے ساتھ ہندوستانی یونین کے مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ بقرعید کے موقع پر ذبیحہ گائے سے احتراز کریں وقت اور وقت کی نزاکت اس ایثار و قربانی کے طالب ہیں"

۲۔ خلیق الزماں صاحب کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد حسین صاحب سکریٹری نیشنلسٹ مسلم پارٹی نے اپیل کی ہے کہ

بقرعید کا زمانہ قریب ہے اس نازک وقت اور ماحول میں کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ مسلم لیڈران اپنی فراخ دلی اور وطن پرستی کا ثبوت دیں اور مسلمانوں کو مشورہ دیں کہ اس سال گائے کی قربانی کسی جگہ نہیں کرنا چاہیئے"

دونوں اپیلیں قابل تحسین ہیں۔ ہر فقرے کے معنی سمجھنا لازمی ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض نگاہوں میں توجیہ اور ذہنیت کھٹکے مگر اصل مقصد اپنی جگہ صحیح ہے اور یقیناً قابلِ عمل ہے

۳۔ اس تحریک کی ان دونوں وجوہات کے علاوہ ایک توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسلام میں محض گائے ہی کی قربانی لازمی نہیں بلکہ دوسرے جانوروں کی بھی اجازت ہے۔ عید قرباں سُنّتِ ابراہیمی ہے اور اس کے دو پہلو ہیں

ایک یہ کہ شیطان نے ہر چند امتحانِ ایثار میں بہکایا مگر بفضلہ دونوں برگزیدہ بندے یعنی باپ اور بیٹے اس کو بے لاگ شکست دے کر حکمِ خداوندی کی تعمیل میں کامیاب ہوئے۔ دوسری یہ کہ کامیابی امتحان پر بطور انعام کے انسانی جان کے بدلے میں جانور کی قربانی جائز ہوئی

اس اسلامی حقیقت کی موجودگی میں اگر ہندوستانی مسلمانوں نے محض گائے کی قربانی پر ضد کی تو یقیناً یہ شیطان کا فریب ہے غور سے دیکھا جائے تو گائے کے مسئلے کو انگریز بہادر نے ہوا دے دے کر خوب آگ بھڑکائی اگرچہ مذہبًا گائے کی قربانی ہی واحد قربانی نہ تھی اب جو لوگ اس ضد کے عامل ہوں وہ یقیناً سنت ابراہیمی سے تعلق نہیں رکھتے۔ شیطان نے گائے کی قربانی کے اصرار میں اقتصادی پہلو چمکایا۔ اول تو اقتصادی پہلو ہے نہیں اور اگر ہو بھی تو وہ اس قدر خفیف ہے کہ قابل غور نہیں

بالفرض گائے اس وقت ستر روپے کو ملتی ہے جس میں سات حصے ہوتے ہیں اور بالفرض بکری کی قیمت دس روپے ہے تو اقتصادی پہلو مطلق نہیں رہا۔ لیکن اگر بکری کی قیمت پندرہ روپے ہو تو فی حصہ پانچ روپے کا نقصان ہو گیا۔ اب اگر اس وقت یہ گوارا کر لیا جائے تو سال بھر میں گائے کے دودھ کی ارزانی اس نقصان کو پورا کر سکتی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس ارزانی کی ذمہ داری مسلمان پر مطلق عائد نہیں ہوتی۔

بہر حال شیطان کے فریب سے ہر قیمت پر بچنا لازمی ہے۔ اور یہ خالص مذہبی پہلو ہے جو وقت کی نزاکت سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے دوسری طرح سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ سنتِ ابراہیمی میں انسانی جان کے معاوضہ میں جانور کی قربانی جائز رکھی گئی ہے۔ لیکن اب اگر آگے چل کر یہاں شیطنت جانور کی قربانی پر انسانی جانوں کو قربان ہونے پر مجبور کر دے تو اللہ محفوظ رکھے۔ انسانی جانوں کو محفوظ رکھنا مذہباً ضروری ہے اس لئے گائے کی قربانی پر ضد کر کے انسانی جانوں کا خون بہا دینا اعلیٰ درجے کی حماقت ہے اور گناہِ کبیرہ

اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کی نمازیں اور مسجدیں باجے گاجے سے بلند اور ارفع ہیں تو غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا۔ جس عبادت میں باجہ گاجہ رخنہ انداز ہو جائے اس عبادت میں خلوص نہیں ہوتا۔ لہٰذا محدود نقطۂ نگاہ کو نظر انداز کر کے نظر کو وسیع بنانا چاہیئے۔

یہ سمجھنا کہ اگر ہم گائے کو قربان نہ کریں گے اور باجے گاجے کو نہیں روکیں گے تو ہماری ذلت ہوگی بالکل غلط ہے اور ایک زبردست

فریب ہے۔ ہمیں تو مذہب کی تعمیل خلوص کے ساتھ کرنا ہے اور فی سبیل اللہ کرنا ہے ہم نہ کسی سے انعام چاہتے ہیں اور نہ معاوضہ چاہتے ہیں۔ تنگ نظریوں سے بچنا اخلاق اور روحانیت کی بلندی اور خوبی کی علامت ہے اور یہی وہ انعام ہے جو خود بخود اللہ کی جانب سے پُر خلوص بندوں کو ملا کرتا ہے۔

مژدہ

بدایوں کے مشہور و ہر دلعزیز رسالۂ نقیب مرحوم کا انتخاب عنقریب شائع ہونے والا ہے، شائقین ادب نوٹ کر لیں

مُسلمان کیا کریں؟

(اخبار قومی آواز ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء لکھنؤ)

کانگریس کی نہیں مانی گئی اور ہندوستان تقسیم ہوگیا۔

کانگریس ہندوستانی یونین کی حکمران بن گئی۔ جغرافیائی تقسیم قلوب کی تقسیم نہیں۔ اس لئے ہندوستان کو جوڑنے کے لئے کانگریس کہتی ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

مسلم لیگ کی سُن لی گئی۔ پاکستان بنا دیا گیا۔ اور مسلم لیگ پاکستان کی حکمراں ہوگئی اور اب وہ کہتی ہے

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

دونوں کا طریق عمل بتائے گا کہ کون اپنے دعویٰ میں کامیاب ہوتا ہے مگر یہ جو کچھ بھی ہوا اسی کا نام آزادی ہے اور اس آزادی کے انقلاب میں مسلمانوں کی تصویر مختصراً یہ ہے :۔

مسلم لیگ پاکستان چلی گئی پسماندگان مسلم لیگ جو ہندوستان میں

براج رہے ہیں، باوجود مسلم لیگ کی کامیابی کے شکست خوردہ معلوم ہوتے ہیں اور اَن کہی کہہ رہے ہیں

نیشنلسٹ مسلم جو کہتے آئے ہیں وہی اب بھی الاپ رہے ہیں انقلاب کا اثر کچھ ہے تو محض اس قدر کہ آزادی سے پہلے وہ غدار کہلاتے تھے اور اب پسماندگان مسلم لیگ کو وہ غدار کہہ رہے ہیں اور بایں سرخروئی کہ "ہم نہ کہتے تھے"

پسماندگان لیگ ہوں یا نیشنلسٹ مسلم۔ باونڈری کمیشن کے فیصلہ کے نتائج سے کوئی محفوظ نہیں۔ قتل و غارت اور خونریزی کا اثر دونوں پر یکساں ہے اور اسی عالم و کیفیت میں یہ فکر ہے کہ "مسلمان کیا کریں؟"

اس کا جواب صاف اور سادہ ہے۔ وہی کریں جو مسلمانوں نے صلح حدیبیہ میں کیا تھا۔ وہی کریں جو مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد کیا تھا۔ وہی کریں جو بالاکوٹ کی شکست اور غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کیا تھا۔ یعنی اپنی حالت و حیثیت کا اندازہ کریں۔ پھر صحیح معنوں میں مسلمان بنیں۔ سیاست کو قطعی ترک کریں تعلیم اسلام سے

مستفیض ہو کر جب خود دار اور خود اعتماد بن جائیں گے تو سیاست خود اُن کے قدموں میں آ پڑے گی

صلح حدیبیہ کی ذلیل ترین شرائط قبول کرنے کے بعد مسلمانوں نے ایک دوسرے پر طنز و تشنیع نہیں کی۔ نہایت صداقت کے ساتھ اپنی اخلاقی و روحانی حالت کو سنوارنے میں مصروف ہو گئے اپنی حالت کو یکسو ہو کر اس طرح سنبھالا کہ قریش کو بدعہدی اور شک کا شبہ کبھی نہیں ہوا یہ اُن کی اخلاقی ترقی اور صداقت ہی کا تو ثبوت ہے کہ جب قریش اپنے یہاں مسلمانوں کو گرفتار کر لیتے تو معاہدہ کے مطابق سخت سے سخت سزا دیتے اور مسلمان اُف تک نہ کرتے اور جب قریش کا کوئی شخص پھنستا تو مسلمان تواضع کرتے عزت و احترام کے ساتھ اُس کو اُس کے گھر پہنچاتے اور خوش ہوتے کہ تکمیلِ معاہدہ کر دی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مذہبی و اخلاقی ترقی نے مسلمانوں کو خود دار اور خود اعتماد بنا دیا۔ وہ دوسروں پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا بھروسہ محض اللہ پر تھا۔

سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد مسلمانوں نے اپنے انتشار کو

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی سرکردگی میں۔ اپنی دآں کو ترک کرکے سنبھالا۔ اپنی سوشل حالت درست کی۔ اپنے اخلاقی پہلو کی اصلاح کی اور تاریخ میں اپنا نام چھوڑ گئے کہ بگڑی ہوئی حالت میں بغیر غیر کا احسان لئے ہوئے اپنے اوپر اعتماد کرکے مسلمان کیسے سُدھرتا ہے

بالاکوٹ کی شکست کے بعد اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے قیامت خیز مصائب کے بعد سر سید احمد خاں کی مساعی جمیلہ نے یکسو بنا کر مسلمانوں کی تمام تر توجہ کو تعلیمی ترقی کی طرف پھیر دیا۔ اور حکومت کو اپنے عمل و کردار سے یقین دلایا کہ مسلمان باغی نہیں

لہٰذا مسلمان احساسِ کمتری کو نظر انداز کرکے انتقامی جذبہ کو لغو قرار دے کر اور جملہ شکوک کو برطرف کرکے سب سے پہلے سمجھیں کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔ اُن کی حیثیت اب ایک حقیر و ذلیل اقلیت سے زیادہ نہیں، جس کے متعلق جناح خود کہہ چکے ہیں کہ اس اقلیت کو پاکستان کی خاطر قربان کر دینا چاہیئے۔ مسلمان

اب تک بھی اقلیت میں تھے لیکن بندر کا سا بانٹ کرنے والی ایک تیسری قوت اب کہاں۔ اب تو اس اقلیت کو براہ راست اکثریت سے واسطہ ہے۔ اس اقلیت کو یہاں بہر حال و بہر صورت رہنا ہے۔ اور اکثریت کے ساتھ بہ حسن و خوبی نباہنا ہے۔ اب وہ اپنی اس حقیقت کو ٹھنڈے دل سے سوچیں اور سمجھیں۔ اقلیت کو جو حقوق حاصل ہیں اُنھیں پرکھیں اور گرہ باندھ لیں اور پھر صبر و سکون سے عمل کریں۔ ان کا عمل صداقت پر ہونا چاہیئے ان کے سچے عمل دو ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اکثریت سے نباہنے کی بہترین صورت اختیار کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے حقوق کے محدود دائرہ میں اپنی بہبودی کی شکل بلا منتِ غیرے نکالیں کوئی مانے یا نہ مانے اُنھیں یہ ثابت کرنا ہے کہ :-

ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

انقلاب نے دنیا بھر کو منقلب کر دیا ہے۔ انقلاب میں ہر جماعت اور ہر پالیسی کی تبدیلی ہو رہی ہے۔ زمانہ بدل رہا ہے اور اشیاء کی قدر و قیمت بھی بدل رہی ہے۔ اسلام انقلاب کا

حامی رہا ہے۔ اور ہمیشہ انقلاب پر غالب رہا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ مسلمان اپنے آپ کو نہ بدلیں اور انقلاب پر غالب نہ آئیں۔ اُن کی وسیع النظری ہر تنگ نظری پر غالب آئے گی۔ اُنھیں تنگ نظر بننے کی ضرورت نہیں۔ انقلاب پر غالب آنے کے لئے ضروری ہے کہ سب مسلمان آپس میں متحد و متفق ہو جائیں۔ لیگی اور قوم پرور مسلمان یہ سب واہیات پارٹی بندیاں ہیں۔ اب اس قسم کی پولیٹکل پارٹیوں کی ضرورت نہیں۔ اب تو یہاں کی مسلمان اقلیت کو سوشل جماعت بننا ہے اور اقلیت کا سچا نمونہ بن کر دکھانا ہے

اس انقلاب نے مسلمانوں کے دل میں خوف و ہراس بٹھا دیا ہے۔ جب اسباب نظر نہیں آتے، جب کہیں سہارا نہیں ملتا تو خود بخود توجہ اللہ کی طرف پھر جاتی ہے۔ اور تسکین حاصل ہو جاتی ہے۔ موت کا ڈر جاتا رہتا ہے۔ اور اگر عمل اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے ذوق و شوق سے کیا جائے تو اللہ کے احساس کی تقویت کا کیا کہنا۔ اللہ بُری باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ اللہ نیکی کی ہدایت کرتا ہے۔ موجودہ ابتلا و مصیبت میں مسلمان کو

اگر اس حقیقت کا احساس ہو جائے تو اس کو سوائے فضلِ ربّی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہی احساس نیک کام کرنے کے لئے اتحاد و اتفاق کی بنیاد بن سکتا ہے

اس انقلاب کا اثر مسلمانوں پر یہ بھی ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔ سب سے بڑا گناہ اُن سے سرزد ہوا ہے کہ اُنھوں نے اللہ پر بھروسہ کرنے کے بجائے قوتِ فرمانروا پر اعتماد کیا۔ انھوں نے انگریزوں سے ہمیشہ بھیک مانگی۔ اور اب بھی بھیک مانگنے میں اُنھیں عار نہیں۔ بھیک مانگنا شرک ہے۔ رعایت طلب کرنا گناہ ہے۔ عطیات پر اعتماد کرنا قوم کے حق میں موت ہے۔ ہجرت کے موقع پر انصار نے مہاجرین کو اپنا بھائی بنا کر نصف ملکیت عطا کر دی تھی مگر مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مہاجرین نے اس کے جواب میں کیا کیا۔ انھوں نے دن بھر محنت مزدوری کی اور دن بھر کی کمائی انصار بھائی کی خدمت میں پیش کر دی۔ انصار نے ازراہِ بزرگی وہ حقیر کمائی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مہاجرین نے ازراہِ خودداری اُن کی گراں قدر

ملکیت قبول کرنے سے انکار کر دیا - یہ حقیقی تعلیم اسلام تھی - اب مسلمان رعایت طلبی کے لئے خوشامد کرتا ہے اور آپس میں رقابت رکھتا ہے اور یہی فریق بندی کی بنیاد ہے - کاش مسلمان اس شرک کی حقیقت کو سمجھیں - توبہ کریں اور سچے موحد کی طرح اپنی ہمت و کوشش پر اعتماد کریں -

اس انقلاب میں انتقامی جذبہ آزاد ہو گیا ہے اُس کو دیکھ کر قانون نے مُنہ چُھپا لیا ہے اور قتل و غارت کو دیکھ کر جانور تک سرنگوں ہے - جنگ عظیم میں جانوں کا اتنا نقصان نہیں ہوا جس قدر یہاں آزادی کی انگلیوں پر گِنی جانے والی مدت میں ہو گیا اس قسم کی خلافِ انسانیت حرکت مسلمانوں کو زیبا نہیں - حضور مولا علی کرم اللہ وجہ جنگ میں اپنے حریف کو چت کر کے قتل کر دینا چاہتے تھے کہ اُس نے روئے پاک پر تھوک دیا تو آپ فوراً چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے اور فرمایا کہ اب تک تو اس کو اللہ کے واسطے مارنا چاہتا تھا اب اس کے تھوکنے پر مجھے غصہ آ گیا کہیں اس کا قتل انتقامی جذبہ میں شمار نہ ہو جائے - اللہ اللہ اس برگزیدہ تعلیم اور

مثال کو چھوڑ کر مسلمان کس وحشیانہ جذبہ میں بہا چلا جا رہا ہے
یہ انتقامی جذبہ عقل کے خلاف۔ انسانیت کے خلاف۔ جو کوئی بھی
اس کا مرتکب ہو وہ دین و دنیا میں مجرم ہے۔ انتقام لینا بندے کا
کام نہیں۔ منتقم حقیقی تو اللہ ہے۔ خلوص قلب کے ساتھ اللہ پر
بھروسہ کرنا چاہیئے۔ مہاتما گاندھی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔
ان کی زندگی سیاست سے شروع ہوئی اب وہ مذہب پر عمل کر رہے
ہیں۔ انھوں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا۔ تمام مذاہب کی
صداقتوں کو چن لیا۔ اور اس طرح اپنا لائحہ عمل بنا لیا۔ یوں کہیئے
کہ سیاست میں پھنسی ہوئی دنیا میں انھوں نے بہت بڑا اجتہاد کیا
اور مذہب کی صداقت کے قدموں پر ساری سیاست کو گرا دیا۔
آج جو وہ کہتے ہیں اور آج جو وہ کرتے ہیں وہ سب مذہب روحانیت
ہے اور اس میں سیاست قطعی نہیں۔ ان کے قول و عمل کا بڑے سے
بڑا سیاست داں معترف ہے۔ وہ اپنی حقانیت کے ذریعہ نہ صرف
امن قائم کر رہے ہیں بلکہ دنیا کی سیاست کی اصلاح کر رہے ہیں۔
انتقامی جذبہ کی آگ ہر طرف روشن ہے۔ گورنمنٹ اور قانون،

پولیس اور ملٹری۔ سب کے سب دم بخود ہیں۔ مگر ایک سیدھا سادا فقیر بے خوف و خطر بڑی آن کے ساتھ اس آگ میں کود رہا ہے۔ جہاں کہیں اس کے قدم جاتے ہیں موت اور آگ دونوں ٹھنڈی ہو کر خاموش ہو جاتی ہیں۔ یہ روحانیت ہی کی تو مثال ہے کہ اس کو کامیابی کے سہرے پہنائے جا رہے ہیں مگر وہ انسانیت کی جان سب سہروں اور تعریفوں سے بے نیاز ہو کر روزہ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اے اللہ آج میں اگر امن نہیں قائم کر سکتا تو مجھے موت دیدے۔ موت حق پرست سے خود ڈرا کرتی ہے۔

ہندو شاید اپنے مذہب کے جزیا کُل سے منکر ہونے کے بعد بھی ہندو رہتا ہے مگر برخلاف اس کے مسلمان اپنے ایمان کے ایک جزو پر شک کرنے کے بعد ہی مرتد اور کافر بن جاتا ہے لہٰذا مسلمان کے لئے مسلمان کا مذہب اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ مداخلت فی الدین کا وہ روادار نہیں ہو سکتا۔ ہندوستانی سرکار مذہبی آزادی کا اعلان

کر رہی ہے اور مداخلت فی الدین کا ہندوستانی سرکار سے
خطرہ نہیں اور اگر کوئی انفرادی طور پر دخل انداز ہو تو وہ خود
سیکولر اسٹیٹ کا دشمن ہے۔ بہرحال مسلمان کو حلف وفاداری میں
مذہب کیوں ہو۔ حلف وفاداری سچا شہری بننے کے متعلق ہے
شہری حقوق میں مذہب و قومیت کا امتیاز نہیں ہے۔ مسلمان کا
مذہب اچھا شہری بننے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ
ہمت افزائی کے ساتھ شاندار ترغیب دیتا ہے اور بے مثال
ہدایت کرتا ہے۔

غرض برائی سے توبہ کر کے نیک ارادہ سے آپس میں متحد
ہو کر سچا شہری بن کر مسلمان کو اپنے عمل سے اکثریت کو یہ سمجھنے
کے لئے مجبور کر دینا چاہئیے کہ وہ تمام شکوک سے بالا ہے۔ اور
صادق العہد ہے۔ قصیدہ پڑھنے اور خود داری کے خلاف عمل
کرنے سے اعتماد حاصل نہیں ہوا کرتا۔ اعتماد محض خلوص سے ملا کرتا
ہے۔ بہترین طریقہ اعتماد حاصل کرنے کا کچھ اس طرح کا ہو سکتا ہے کہ
اقلیت اپنے حقوق پر مطمئن ہو کر دکھا دے اور رعایت طلب نہ کرے۔

لیجسلیچر میں مخالفت نہ کی جائے بلکہ سچا مشورہ دیا جائے
ممبران لیجسلیچر جو مسلمان ہوں اُن کا بہترین فرض یہ ہے کہ اپنے
حقوق کے تحفظ کا خیال رکھیں۔ اس کے علاوہ جملہ سیاست و
انتظام کا ذمہ دار حکومت کو بنائیں۔ آئندہ الکشن بازی سے
احتراز کیا جائے۔ بالمقابلہ ایسے منتخب ممبر بھیجے جائیں جو اِن
اصولوں پر کام کر سکیں۔ جب اس طرح کا عمل ہوگا تو سرکار خود بخود
خلوص کا سکہ مان لے گی اور مسلمان پر پورا بھروسہ کرے گی

سیاست سے اس طرح فارغ ہو کر اور روزانہ زندگی میں
رواداری برت کر تمام وقت اور توجہ کو مسلمان اپنے مذہبی۔
اخلاقی اور سماجی ترقی میں بے غل و غش صرف کر دیں۔ یہ اصلاح
و کوشش محض مسلمان بننے کے لئے ہو اور سچا مسلمان سچا شہری
بننے کا مستحق ہے۔ اس میں سیاست کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ اس میں
کوئی معاندانہ پہلو نہ ہو۔ اس میں کسی کو اعتراض نہ ہونے پائے۔
یہ اصلاح اور کوشش "دل بہ یار دست بکار" کے اصول پر
ہونا چاہیئے۔

اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اصلی مسلمان بننے کی کوشش کی جائے۔ جب تک یہ ڈگری حاصل نہ کرلی جائے اُس وقت تک عام مسلمان قابل وقعت نہ سمجھا جائے۔ پابندی مذہب ہر مسلمان کا طرۂ امتیاز ہو۔ نماز پنجگانہ شرطِ اولین ہے۔ نماز برائی سے روکتی ہے۔ ایسی نمازوں کا اعتبار نہ کیا جائے جو برائی سے نہ روک سکیں۔ روزے کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے اس لئے کہ روزے سے حلم و صبر کی طاقت بڑھتی ہے۔ حلم و صبر اقلیت کے لئے بہت ضروری ہے۔ صاحبِ استطاعت زکوٰۃ کے عادی بنیں۔ زکوٰۃ چندے اور بھیک مانگنے کی بُری عادتوں سے نجات دلاسکتی ہے۔

ان اوصاف سے متصف ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان کو اپنے کلچر اور اپنی سماج کی فکر کرنا چاہیئے۔ ملازمت برطرف، تعلیم تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کی طرف بیش از بیش توجہ کرنا ضروری ہے۔ مقامی دست کاری اور مقامی تجارت میں بے لاگ حصہ لینا چاہیئے۔ ضرورت نہیں کہ کاروبار ہزاروں اور

لاکھوں روپیہ سے شروع کیا جائے، تقسیم کار ضروری ہے پھر جس کے پاس جتنی دولت ہو خواہ وہ حقیر ہی کیوں نہ ہو۔ گردش میں لائی جائے اور لوٹ پھیر جلد جلد کیا جائے تاکہ محنت ٹھکانے لگے اور نفع سامنے آئے۔ یہ جملہ کاروبار محض وہ ہو جو روزانہ کی زندگی میں آسانی بہم پہنچا سکے اور ضروریات زندگی میں کسی کو محتاجی نہ رہے۔

یہ ایک کا واک خاکہ ہے جو پیش کر دیا گیا۔ ضرورت ہے کہ وہ مسلمان حضرات جو نئی اور پرانی دونوں تعلیموں سے آراستہ ہوں اور نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے سختی سے پابند ہوں۔ ان مسائل پر غور کر کے خلوص اور صداقت کے ساتھ اپنی ترقی و بہبودی کا پروگرام بنائیں اور یہ پروگرام صحیح ہو گا۔ سہل الحصول ہو گا اور اس میں انشاء اللہ کامیابی ہو گی۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

دیوالی کا پیغام

(مطبوعہ اخبار ہندی ادھیکار دیوالی نمبر لکھنؤ نومبر ۴۳ء)

برسات ہندوستان میں رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ کھیتوں کو زندگی بھی بخشتی ہے اور مکانوں کو نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ انسان رحمت اور زحمت کے چکر میں مبتلا ہونے کے لئے مجبور ہے۔ رحمت چاہتی ہے کہ کھیت جوتے اور بوئے جائیں۔ کھیتی پروان چڑھے اور محنت کے پھل لہراتے ہوئے نظر آئیں۔ زحمت کے اثر کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مرمت اور صفائی کر کے گھروں کو جنت بنایا جائے۔ اس طرح اس رحمت اور زحمت کے چکر کی قید سے نکلنے کے بعد انسان اپنے اندر آزادی کی لہر محسوس کرتا ہے۔ اِدھر اُدھر کی فکر اُسے جب نہیں ہوتی تو وہ خالص خوشی منانا چاہتا ہے۔ ایسی خوشی جو تکلیف کو بھلا دے۔ ایسی خوشی جو فکر اور غم کو پاس نہ پھٹکنے دے اور اس کی امید اور آرام کو

سرسبز رکھے۔ آزادی کی اس خوشی کا نام دیوالی ہے۔
یا پھر اسے یوں سمجھا جائے کہ کٹھن منزل طے کر کے بڑی کامیابی کے ساتھ لنکا کو فتح کر کے رام اجودھیا پہنچ گئے۔ تمام شہر میں استقبال کی تیاریاں ہوئیں۔ ہر طرف چراغاں ہے شہر کا شہر جگمگا اُٹھا۔ ہر طرف خوشی اور مسرت بکھری ہوئی ہے۔ دل کی کلیاں کھل گئیں۔ دوست دشمن ایک ہی رنگ میں نظر آنے لگے۔ گھروں اور گھروندوں کے نئے ماڈل تیار کر کے انجینئرنگ کے فن کا ثبوت پیش کیا جا رہا ہے۔ اپنے اپنے کھیتوں کی بالیاں تحفہ میں دے کر زراعتی نمائش کی جا رہی ہے اور اپنے اپنے گھروں میں بزرگوں اور رشیوں کی تصویریں بنا کر مورتیاں سجا کر مصوری اور عقیدتمندی کا کمال دکھایا جا رہا ہے۔ سچی خوشی میں بغض۔ تعصب اور دشمنی کی گنجائش نہیں ہوا کرتی۔ ایک دوسرے سے لڑا نہیں کرتے۔ دھوکے سے چھریاں نہیں بھونکا کرتے بلکہ ہنسی خوشی سے ایک دوسرے کے ہنر اور کمال کی داد دیا کرتے ہیں۔ کھیل اور کھلونوں سے منھ میٹھا کیا کرتے ہیں

دعوتیں ہوتی ہیں۔ رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ شکتی کا دیوتا اور لچھمی کی دیوی ایسی خوشی منانے والوں پر اپنی تمام نعمتیں اور انعام نچھاور کیا کرتے ہیں۔ تاکہ اگلی دیوالی تک امن اور خوشی کی بہار رہے۔ فتنہ و فساد مٹ جائے اور آئے دن عید اور رات شب برات ہو۔

ہندوستان نے زحمت اور زحمت کی بھول بھلیوں سے نکل کر اور کٹھن منزل طے کر کے اس سال فتح اور آزادی حاصل کر لی ہے۔ ایسی آزادی جس میں خون خرابے نہیں ہوئے اور جو نہایت امن کے ساتھ آئی مگر دیوالی کا تیوہار منانے کے لئے ہندوستان میں کسی نے ایسا جادو پھینک دیا کہ آزادی کی خوشی نہ منائی جا سکی۔ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ اور قتل و غارت کا بھوت زندہ ہو گیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انجینئرنگ آرٹ اور انڈسٹریز کو ترقی دے کر اپنے آرام کی شکل نکالی جاتی تاکہ آزادی کی خوشی ہمیشہ کے لئے قائم رہتی۔

آج یہ دیوالی ہندوستان والوں کو یہ جتانے آئی ہے
کہ شکتی کے دیوتا کے گن گاؤ۔ لچھمی سے بہتری کی امید رکھو
امن قائم کرو۔ خوشی رچاؤ۔ چین مناؤ اور اسی طرح اندھیرے
میں اُجالا پھیلاؤ۔ نہیں تو اندھیرے ہی اندھیرے میں سوائے
نقصان کے اور کوئی فائدہ نہیں

گرونانک صاحب کا فلسفہ

مطبوعہ قومی آواز لکھنؤ ۲۰ر نومبر ۴۷ء

گرونانک صاحب نے یہ محسوس کیا کہ محدود و مجبور انسان لامحدود قادر مطلق کا احاطہ نہیں کرسکتا اور بندے کی عقل اللہ کی حقیقت تک رسائی نہیں کرسکتی۔ لہٰذا حقیقت لامحدود کو سمجھنے کے لئے اپنے آپ کو لامحدود بنانا ضروری ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو فنا کرکے اپنے حدود کو پھلانگ کر پار گذر جائے۔ صوفی لوگ جو ایران سے تصوف لائے ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو فنا کرکے اللہ کی بے رنگی میں رنگ جاؤ اور اخلاق الٰہی پیدا کرلو تو خالق کو پہچان لوگے۔ اہل ہند کا ویدانتی فلسفہ بھی اسی قسم کی تعلیم دیتا ہے۔ ان دونوں اصولوں کی موجودگی میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جو راستہ گرونانک نے اختیار کیا

وہ صاف اور سادہ ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ وحدہٗ لاشریک نے اپنے ارادے سے اپنی قدرت کا ظہور فرمایا ہے۔ لہٰذا اس کی مرضی پر ہنسی خوشی سر جُھکا دینا کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ پھر خدا شناسی اور خود شناسی کے لئے ذکر کی تلقین۔ دھیان کی تاکید۔ عمل صالح کی تعلیم خدمت خلق کی فہمائیش اور خاکساری دعا جزی کی ضرورت پر اپنی تعلیم کی بنیاد رکھی ہے مرضی آلٰہی کی تعمیل کرنا نیکی ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہو وہ بدی ہے ۔ اللہ کی خوشی کے مطابق کام کرنا عمل صالح ہے۔ اسم سے مسمیٰ کا نشان مل جاتا ہے اس لئے ذکر الٰہی کو اپنی تعلیم کا اصل جز قرار دیا ہے۔ اللہ کے نام سے بدی دُور ہوتی ہے اور نیکی کی ہدایت ہوتی ہے۔ دھیان کرنے سے اسم الٰہی کے اوصاف نظر آتے ہیں اور حاصل ہو جاتے ہیں۔ خدمت خلق سے خالق خوش ہوتا ہے اور انعام مرحمت فرماتا ہے۔ عجز اختیار کرنے سے شر اور تکبّر کی جڑ کٹتی ہے۔

محدود انسان کو لامحدود بننے کے لئے مختلف منزلیں طے

کرنا پڑتی ہیں۔ اس مسافر کا سفر دریا کے سفر کی طرح کا ہوتا ہے۔ دریا مختلف گھاٹیوں کو طے کرتا ہوا سمندر میں گر پڑتا ہے اور اس کے بعد دریا خود سمندر بن جاتا ہے۔ اب اس کو دریا کہنا غلط ہے۔

گرونانک کی تعلیم کے مطابق مسافر کی پہلی منزل کا نام "دھرم کھنڈ ہے"۔ یہ عمل کا میدان ہے جیسا عمل ہوگا ویسا ہی اجر ملے گا۔ قوت فیصلہ یہاں کارفرما ہوتی ہے۔ انعام عمل و محنت پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ فضل و رحمت الٰہی پر ہوتا ہے۔ محنت کے صلہ کو انعام سمجھنا غرور اور تکبر کی علامت ہے۔

"گیان کھنڈ" دوسری منزل ہے جہاں عمل کے ساتھ علم بھی شامل ہو جاتا ہے۔

تیسری منزل "سُران کھنڈ" کہلاتی ہے جہاں بغیر کوشش کے علم و عمل کے نتائج ملتے ہیں کیونکہ علم و عمل عادت میں داخل ہو کر فطرت ثانی بن جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ وجدان ہے اس منزل قرب میں جمال الٰہی نظر آنے لگتا ہے۔ مسرت جمال کی

وجہ سے بے خودی طاری ہو جاتی ہے اور مسافر کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔

چوتھی منزل "کرم کھنڈ" کہلاتی ہے جہاں پہنچ کر مسافر کو اختیار مرحمت ہو جاتا ہے۔ احساس قوت۔ خوف مرگ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور اس سے کسی قسم کے نقصان کا خطرہ نہیں رہتا۔ آخری منزل کا نام "سچ کھنڈ" ہے جس میں فنا کے بعد بقا مل جاتی ہے۔ یہاں بے صورتی کا راج ہوتا ہے۔ تعینات کا پتہ نہیں رہتا حجابات اور امتیازات اُٹھ جاتے ہیں۔ بندہ و صاحب کی مرضی ایک ہو جاتی ہے۔ بندہ خود خدا میں جذب و وصل ہو کر بندگی سے گذر جاتا ہے۔

گرو نانک کا وحدت وجود

گرو نانک کی توحید جملہ اہل وجود کی توحید سے ماخوذ ہے جس میں ویدانتی توحید سے صوفیاء کی توحید کا حصہ زیادہ ہے مسلمانوں کے علماء ظاہر صوفیاء باطن کی توحید وجودی سے

اختلاف کر کے اور مضمونِ وصل کو نہ مان کر۔ خالق و مخلوق کے درمیان امتیاز قائم رکھنے کو لازمی قرار دیتے ہیں اور وصل کے بجائے وہ محض دیدارِ الٰہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ علماءِ ظاہر کی اس تعلیم کو توحیدِ شہودی کہتے ہیں۔ اہلِ وجود ہوں یا اہلِ شہود سب کے سب مخلوق اور کائنات کو ارادۂ الٰہی کی حرکت سمجھتے ہیں۔ کائنات کی زندگی میں ارادۂ الٰہی ہی کارفرما نظر آتا ہے اور اسی کی وجہ سے ارتقاء کی منزلیں طے ہوا کرتی ہیں اب اگر آخری منزل وصل ہے تو اہلِ وجود اس طرح ارادۂ الٰہی کو ساکن بنا دیتے ہیں۔ اہلِ شہود سکونِ وصل کو ناجائز قرار دے کر ارادۂ الٰہی کو دیدارِ الٰہی کی آخری منزل میں محدود کر کے ایک ہلکے قسم کا سکون پیدا کرتے ہیں اور مسرتِ دیدار میں کھو جاتے ہیں۔

اب اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں گروہ قابلِ اصلاح ہیں۔ سکون و سکوت سے ارادے کا تصور نہیں پیدا ہو سکتا بلکہ ارادہ تو حرکت کا متقاضی ہے۔ ارادہ میں حرکت ہوا کرتی ہے

اور لازوال و لامحدود حرکت، خدا کے ارادے کے لئے ضروری ہے۔ لہٰذا سکون خواہ وصل کا ہو یا دیدار کا ارادۂ الٰہی کی شان کے خلاف ہے اور آخری منزل کا تعین غلط ہے۔ معلوم ہوتا ہے قیاسی علم منطق کے اصول کے مطابق ان حضرات نے سلسلۂ لاعتناہی کو لغو سمجھنے کی وجہ سے خاتمہ یعنی آخری منزل کو ضروری سمجھا اور یہ صورتیں ایجاد کرلیں لیکن حقیقت واقعی اس سب سے جُدا ہے۔

جو گروہ سلسلہ نامتناہی کا قائل ہونے کی وجہ سے تناسخ کو تسلیم کرتا ہے وہ بھی توحید کو مقید کر دینے کا ملزم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ سیدھی سی مختصر بات تھی جس کو قیاسی علم نے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ لامحدود۔ اس کا ارادہ لامحدود اور اس کی مخلوق لامحدود۔ ان میں سے کسی کو بھی زوال نہیں۔ لہٰذا بجائے وصل، دیدار یا تناسخ کے ارادۂ و حرکت کی لازوالی کے لئے ضروری ہے کہ تحریک کبھی ختم نہ ہو۔ جب تحریک مسلسل ہے تو محرک کے ساتھ متحرک بھی لازوال ہونا چاہیئے۔

لیکن نسبتِ وجود جُز کا میلان کُل کی طرف رکھنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔ بیشک جُز اپنے کُل کی طرف مائل رہنے کی تمنا رکھتا ہے اور اسی آرزو کی وجہ سے ارتقاء حاصل کر کے وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے لیکن کُل چونکہ لامحدود ہے اس لئے اس سے مل نہیں پاتا۔ مل نہیں سکتا۔ ہر دریا خود سمندر کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ مگر اصل سمندر کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس کوشش میں محدود، لامحدود بنتا رہے گا۔ مگر لاشریک سے اس کی حیثیت وہی قطرے کی سی رہے گی۔ "کل یومٍ ھو فی شان"

گرو نانک صاحب اپنی روحانیت کے ذریعہ جس عالم میں بھی ہوں اپنی مسرت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے رہیں۔ انھوں نے محبت۔ امن اور مسرت کا وہ سبق پڑھایا ہے کہ زمانہ دیکھے اور دل سمجھے۔ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے اپنی کل تعلیم کی بنیاد ذکرِ الٰہی پر رکھ دی۔ نام جپنے سے مسرت و محبت میں ترقی ہوتی ہے اور امن کا

قیام مستقل ہو جاتا ہے لیکن بعد میں انقلاب لا زوال کے اثرات کی وجہ سے گرو نانک کی تعلیم میں روحانیت کو برقرار رکھنے کے لئے عمل صالح کو ذکر سے مقدم کر لیا گیا۔ گرو نانک اپنی بندگی ختم کر کے جب سے خدا میں شامل ہو گئے ہیں اپنی تعلیم و مقاصد کی خاص طور پر نگرانی کر رہے ہیں۔ مرضیٔ مولیٰ نے ضروری سمجھا کہ اس اجتہاد کا سہرا گرو گوبند جی کے سر بندھے۔ یہ اجتہاد جو گرو گوبند جی نے کیا ہے قابلِ قدر اور لائقِ آفریں ہے اس سے گرو نانک کی تعلیم کی تجدید متصوّر ہو سکتی ہے اور تردید و مخالفت کا پہلو اس میں نہیں ہو سکتا۔ مگر یورپ کی مادیت نے روحانیت کو زیر کرنے کے لئے گرو گوبند جی کے عمل صالح کا مفہوم توڑ مروڑ کر کچھ سے کچھ کر دیا۔ مسرت جو گرو نانک ذکر کی بدولت امن و محبّت سے حاصل کرنا چاہتے تھے اور مسرت جو گرو گوبند جی عمل صالح کے ذریعہ امن و محبت سے پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دشمنوں کی

رخنہ اندازی ۔ اُس مسرت کے حاصل کرنے کا طریقہ شور و شغب کے ذریعہ سمجھا رہی ہے ، آج کل کُجگ میں ہر مذہب کی تخریب اسی طرح ہو رہی ہے مگر جو اہلِ نظر حضرات ہیں وہ شیطنت کو دُور کرنے میں منہمک ہیں اور بُرائی کو دُور کر کے حقیقت کو ماہِ کامل کی طرح نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بھگت لکشمن سنگھ صاحب ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز نے اپنی کتاب "گرو گوبند سنگھز" آئیڈیلزم" میں گرو گوبند جی کے الفاظ سے اس مغالطہ کو صاف کیا ہے :۔

اے پاک لوگو! تم سب سمجھ لو کہ میں محض اس لئے پیدا کیا گیا ہوں کہ حق کو چمکاؤں ۔ نیکی کو اُچھالوں اور تمام بدی کرنے والوں کو بیخ و بُن سے تباہ کر دوں ۔

دوسری جگہ گرو گوبند سنگھ اپنے اس مفہوم کو صاف صاف اس طرح واضح کرتے ہیں :۔

اے میرے آقا! گناہ اور مصیبت اُن لوگوں کے پاس نہیں پھٹکتے جو تیرے نام کا دھیان کرتے ہیں ۔ اے

میرے آقا! جو اپنے دماغ میں تیرے علاوہ غیر کے خیال کو جگہ دیتے ہیں وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرتے ہیں۔

گرو نانک کی برہمنوں نے مقدور بھر مخالفت کی مگر ان کی روحانیت غالب آئی۔ گرو گوبند جی کے اجتہاد کو یورپ کی مادیت کتنے ہی غلط رنگ میں بیان کرے مگر روحانیت چمکے گی اور چمک کر رہے گی۔ توحید کا قائل شرک کے طوفان سے بے لاگ بچ کر نکلے گا۔ نام کا جاپ کرنے والے اور اللہ کا دھیان رکھنے والے بُرائی سے دھوکہ کھا سکتے ہیں مگر اس میں پھنس نہیں سکتے۔ مادیت کے ذریعہ نجات نہیں حاصل کی جا سکتی۔ امن، محبت اور مسرت صرف روحانیت کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ مہاتما گاندھی کا عمل روحانیت پر ہے شکستوں سے وہ گھبراتے نہیں۔ فتح کا سہرا اُن ہی کے سر رہتا ہے۔ گرو نانک کی تعلیم بھی یہی ہے کہ جاپ کرو۔ دھیان کرو۔ امن و محبت کو پھیلاؤ۔ دین و دنیا کے مالک تم ہی ہو گے۔ توحید کا بول

بالا ہوگا۔" نام جاپ" برائی کو دور کر دے گا۔ ذکر سے قلب کو تسکین بلا کرتی ہے یہی اہلِ وجود کا طرۂ امتیاز ہے۔ خواہ وہ بابا فرید ہوں یا گرو نانک!

رہے نام اللہ کا

ایک صلاح

(قومی آواز ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء)

پانیر اور نیشنل ہیرلڈ مورخہ ۲۵ مارچ میں احتشام محمود صاحب نے آزاد کمیٹی کو ختم کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اُن کے وجوہات جو کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ آزاد کمیٹی میں دو عملی پائی جاتی ہے، اور اس کی تہ میں "دو قومی نظریے" جھلک مار رہے ہیں۔ اس کمیٹی کے قدر دان مہاتما گاندھی ہو سکتے تھے مگر، آں قدح بہ شکست وآں ساقی نماند۔ اور اب آزاد کمیٹی کے پروان چڑھنے کی کوئی صورت نہیں۔ اندریں حالات حضرت مولانا آزاد مدظلہ العالی نے اپنے فیصلے پر اگر نظرثانی فرمائی تو مجھے یقین ہے کہ ختم بالخیر کہہ دینے میں اُنھیں خود بھی کوئی تکلف نہ ہوگا۔

ہمارے سامنے اس وقت "دو" راہیں ہیں "راہِ سیاست"

اور "راہِ مذہب" اگر ہم سیاست کو اصل مقصد بنانا چاہتے ہیں تو مذہب مقید ہو کر رہ جائے گا اور ہم اکثریت میں مدغم ہونے کے لئے مجبور ہیں۔ گویا ہم، ہم نہیں رہیں گے۔ لیکن اگر ہم مذہب کو مقدم سمجھتے ہیں تو سیاست کی اہمیت قطعاً جاتی رہے گی۔ ان دونوں سروں کو بہ صورت موجودہ ملا دینا خیالِ محال ہے، اور دو عملی سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں میں سے ایک کا انتخاب کیا جائے۔

مسلمان کی نگاہ میں سیاست مذہب کے مقابلے میں کوئی معنے نہیں رکھتی۔ اس انقلاب آزادی کے بعد سیاست کو خیرباد کہہ دینے میں کوئی ہرج بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ہماری جیسی اقلیت کو سیاست سے علیحدگی مضر نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ ہم اکثریت کے شکوک کو رفع کر کے اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے، سیاست کو ترک کر دینا مفید ہے۔ اکثریت اپنے وقار اور اپنی نیک نامی کے لئے کم و بیش کچھ حقوق اقلیت کو دینے کے لئے مجبور ہے۔ ہمیں

ان ہی پر قانع ہونا چاہیئے اور ان حقوق سے فائدہ حاصل
کرنا چاہیئے، لیکن حقوق کے لئے کسی قسم کی جد و جہد محض
بیکار ثابت ہو گی - آج مسلمان اگر دل کھول کر اپنی اقلیت
والی موجودہ حیثیت کو سمجھ لے تو اپنی فریاد و فغاں سے تائب
ہو سکتا ہے - اسمبلی، بورڈ اور کمیٹیوں میں تناسب حاصل
کرنے کی جد و جہد اور پھر انتخابات کی دَوڑ دھوپ کا لطف
اسی وقت تک تھا جب تک کہ انتخابات جداگانہ کا دَور دَورہ
تھا، اب مخلوط انتخاب ہو جانے کے بعد اس کی ضرورت ہی
نہیں رہی - ملازمتیں حاصل کرنے کا معیار اب قابلیت ہے۔
قابلیت کے علاوہ ہر قسم کی جد و جہد بے معنی ہے۔ گائے کا
مسئلہ، زبان کا مسئلہ، باجہ اور جلوس، تعیش کی باتیں تھیں،
اب اقلیت کو اس پر اصرار قطعی زیبا نہیں - مختصر یہ کہ جب
سیاست کی یہ حقیقت رہ گئی تو اُسے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔
اس طرح یکسوئی حاصل کرنے کے بعد ضروری ہے کہ
ہمہ تن مذہب کی طرف توجہ کی جائے، اور اپنے اخلاقی

اقتصادی، اور معاشرتی حالات کو سُدھارنے اور مستحکم بنانے میں پورے انہماک سے کوشش کی جائے۔ اسلامی نظام اس لائحۂ عمل کا ہر طرح ضامن ہونے کو تیار ہے، اور ضرورت نہیں کہ ہم کسی عارضی نظام مثلاً سوشلزم اور کمیونزم وغیرہ کا اتباع کریں۔

جمیعۃ العلماء اگرچہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے لیکن یک طرفہ ہونے کی وجہ سے دورِ حاضر میں چلنے والوں کے ساتھ قدم بہ قدم نہیں چل سکتی۔ ضرورت ہے کہ علماء کرام علم حاضر میں دستگاہ حاصل کریں، اور جو حضرات نئی تعلیم سے آراستہ ہیں وہ علمِ دین میں کمال پیدا کریں۔ پھر اپنی اہلیت اور موجودہ فضا کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کو قرآنی تعلیم سے مزین کیا جائے، اور از سر تا پا نمونہ بنانے کی کوشش کی جائے۔

قرآنی تعلیم کے مطابق اسلامی نظام کے دو جز ہیں۔ انفرادی یا ملکی، اور اجتماعی یا مدنی۔ جزِ اوّل کا مدعا یہ ہے کہ صحیح تعلیم کے ذریعہ

اخلاق کو درست کیا جائے۔ اور دوسرے جُز کا مقصود ہے کہ اقتصادی اور معاشرتی پہلو کو مضبوط بنایا جائے۔ یہ دونوں جُز اگرچہ لازم و ملزوم ہیں مگر انفرادی تعلیم کو جس کے ذریعہ افراد کے اخلاق سنوارے جاتے ہیں اولیت و اہمیت حاصل ہے۔ نئی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ پرانی عمارت کو پہلے ڈھا دیا جائے ان دلچسپیوں اور طریقوں اور ان افکار و خیالات سے جن کے ہم عادی رہ چکے ہیں دل و دماغ کو صاف کر لینا شرطِ اوّلیں ہے۔ پھر قرآنی تعلیم حاصل کرنے کے لئے عزم و ارادہ کی ضرورت ہے، صبرِ ایوبؑ درکار ہے تاکہ حکمت و دانائی کے ساتھ عملی قوتوں کو بیدار کیا جا سکے۔ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اسلامی نظام کے ماتحت ہمارا واحد پروگرام اپنی اخلاقی، اقتصادی، اور تمدنی حالت کو درست کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اکثریت کے دربار سے جو حقوق ملیں اُن سے مستفیض ہونا ضروری ہے، لیکن ان کو اہمیت دینا نہیں ہے اور نہ سرکار سے مخالفت کرنا ہے۔

اس اسلامی نظام کی حقیقت سمجھنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو نمونہ بنانا ضروری ہے۔ ہماری موجودہ حالت پر "صلح حدیبیہ" کا واقعہ منطبق ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ میں مکہ کی حکومت کی اکثریت نے مدینہ کی مسلمان اقلیت سے جو معاہدہ کیا تھا اُس کے شرائط سخت اور ناگوار تھے کہ کوئی مسلمان قبول کرنے کو تیار نہ تھا مگر رسول اللہ صلعم نے قبول کر کے نہ صرف اکثریت کے شکوک رفع کئے بلکہ ان ذلیل شرائط کو سچائی سے نباہ کر اعتماد حاصل کیا، اور پھر یکسوئی کے ساتھ مسلمانوں کی تعمیر کو مکمل فرما دیا۔ ڈاکٹر اقبال اسی اصول کی تبلیغ کرتے ہوئے صلائے عام دیتے ہیں۔ ع تعمیر خودی کر، اثرِ آہ رسا دیکھ

یہ کوئی راز نہیں کہ سیاست مذہب کی لونڈی ہے، اور مذہب کو تقدم و تفوق حاصل ہے۔ اسلام کی جامعیت کو اپنے عمل سے ثابت کر کے مخالفین کو دوست بنایا جا سکتا ہے، اور مساوات و اخوت کا سبق پڑھا کر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ انشاء اللہ۔

گرد راہ کا شکریہ

از

مولانا انور صابری صاحب

نظر شناسِ حقیقت سے پوچھ لے کوئی
جہانِ عشق کا سرمایۂ نگاہ ہے یہ
نگاہِ کم نگہاں سے نہ دیکھنا اس کو
تو "گرد راہ" سمجھتا ہے خضرِ راہ ہے یہ

گرد راہ

مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بننے، رسول صلعم کے اسوۂ حسنہ پر چلنے اور سیاست سے علیحدہ ہو کر اپنی تعمیر کرنے اور اقتصادی حالت کو سنبھالنے اور نئے انقلاب سے مقابلہ کرنے کا طریقہ سکھاتی ہے

گرد راہ

کو

محکمۂ تعلیم یو، پی نے

سیکنڈری ہائی اسکول کے ٹیچرز اور تمام لائبریریوں

اور

کتب خانوں کے لئے پسند کیا ہے

دھوپ چھاؤں

وحید احمد کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے

زبان صاف اور سادہ ہے۔ مسائلِ حاضرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انقلاب کی حقیقت دکھائی گئی ہے۔ اس میں سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں قسم کے مضامین ہیں جو مختلف اخباروں میں شائع ہو کر قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

زیرِ طبع ہے

تصوّف کی اصلیت

مُصنّفہ

وحید احمد

تنقیدات سے خود رائے قائم کیجیے

ذوالقرنین بدایوں:- سلیقہ کے ساتھ صوفی ازم کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا ہے۔
تنویر لکھنؤ:- جا بجا بہت سی کام کی باتیں اور تحقیقی نکتے بھی اس میں ملیں گے۔
نیا ہندوستان علیگڈھ:- مضامین کی ترتیب اور پیرایہ اہم ہے۔
مدینہ بجنور:- زبان و بیان کی سادگی کے لحاظ سے ایک کامیاب اور قابل قدر کوشش ہے۔ کاش اس مختصر کتاب کے مطالعہ سے ہمارے دل و دماغ کی سوئی ہوئی قوتیں بیدار ہو جائیں۔
سرپنچ لکھنؤ:- موضوع خشک ہے مگر دلچسپ ترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر عام مسلمان اپنی سیاسی و معاشرتی گتھیوں کو سلجھا سکتے ہیں۔
کاروان الہ آباد:- طرز بیان اور زبان کے لحاظ سے کتاب قابل مطالعہ ہے۔ مصنف نے اپنے طور پر معلومات کا کافی ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔
نگار لکھنؤ:- نہایت خوبی سے اس عام خیال کو رد کیا ہے کہ اسلام میں تصوّف، متعدد ویدانت اور عیسوی رہبانیت سے لیا گیا ہے۔ زبان، انداز بیان اور طرز استدلال کے لحاظ سے رسالہ بہت دلچسپ ہے۔

روشنی سری نگر:۔ یہ رسالہ مفید اور اہم معلومات سے پُر ہے اور تصوف کے متعلق ایک کامیاب کوشش ہے۔

رہبر کانپور:۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مصنف کی کاوشِ فکر کامیابی سے قطعی ہمکنار ہے۔

معارف اعظم گڈھ:۔ اصلی تصوف کو مختصر طور پہ سمجھنے کے لئے مفید کتاب ہے۔

نیشنل ہیرلڈ لکھنؤ:۔

تعمیر لکھنؤ:۔ اس کتاب میں ژولیدہ بیانی کیوں اختیار کی گئی؟

صدق لکھنؤ:۔ بڑے بڑے لمبے مسائل کو سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی ہے مصنف کے صفاءِ بیان اور سلاست زبان کے باوجود پڑھنے والوں کے ذہن پہ کچھ زیادہ سلجھے ہوئے نقوش و تاثرات قائم نہیں ہوتے۔

انصاری دہلی:۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا منشاءِ تحریر کچھ ہے ہی نہیں .... اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ کتاب کا شروع سے آخر تک مطالعہ کر چکنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ تصوف کی اصلیت کیا ہے۔

سلطان حیدر جوشؔ (ذوالقرنین بدایوں) } اس مختصر مگر ٹھوس کتابچہ میں اس قدر مغز ہے کہ بایدؔ و شاید روزنامہ انصاری دہلی کی لچر نکتہ چینی کا جواب صرف اسقدر کافی سمجھتا ہوں کہ بریں عقل و دانش ....۔

یونائٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ